بسم اللہ الرحمن الرحیم


# پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۱ | ۱۰ ستمبر ۲۰۲۴ء مطابق ۶ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ | شمارہ نمبر ۲۱


## اس شمارے میں


**شعروادب**
جو دنیا میں انساں کو انسان بنانے..... ابوالمجاہد زاہدؔ ۴

**اداریہ**
بہارِ اولیں اور ظہورِ قدسی۔فطرت کی..... محمد عمیر الصدیق ندوی ۵

**بروتقوی**
دینی واصلاحی کاموں میں باہمی تعاون حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ۷

**اسوۂ حسنہ**
علمی، دینی وتربیتی سرچشمہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ۱۱

**انسانِ کامل**
انسانیت کی مسیحائی مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی ۱۳

**علم ودین**
تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ۱۴

**حب نبوی ﷺ**
اطاعت کے بغیر ایمان ومحبت..... ڈاکٹر محمد سراج الدین ندوی ۱۶

**نقوش وتاثرات**
پروفیسر رشید کوثر فاروقی۔سئی کی وادی..... مولانا عبدالمتین منیری ۱۸

**رحمت عالم ﷺ**
رسول اکرمؐ کا یتیموں کے ساتھ برتاؤ خالد فیصل ندوی ۲۴

**بعثت نبوی ﷺ**
حضورؐ کی بعثت کے چند اہم مقاصد محمد جمیل اختر جلیلی ندوی ۲۷

**تعارف وتبصرہ**
مرزا غالب اور جان کیٹس..... محمد اصطفاء الحسن ندوی ۳۰

**فقہ وفتاویٰ**
سوال وجواب مفتی محمد ظفر عالم ندوی ۳۳



سرپرست

**حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی**

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول: شمس الحق ندوی

نائب مدیر: محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر: محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت: مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی



قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

**TAMEER E HAYAT**
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایم میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

**TAMEER-E-HAYAT**
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com



مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔



| سالانہ زرتعاون -/400 | فی شمارہ -/20 | ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔75$ |
|---|---|---|

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلدی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

# جو دنیا میں انساں کو انسان بنانے آیا تھا

ابوالمجاہد زاہدؔ

معمارِ تہذیب ' جہانِ تازہ بسانے آیا تھا
کانٹوں کو گل ، ذروں کو خورشید بنانے آیا تھا

اہل جہاں نے شعبِ ابی طالب میں اسی کو قید کیا
اہل جہاں کو بند غلامی سے جو چھڑانے آیا تھا

اس پر سنگ ملامت برسے، طائف کے کہساروں سے
جو طائف کے کہساروں پر پھول اُگانے آیا تھا

شمعِ حیات اُسی کی بجھانی چاہی ظلمت زادوں نے
جو ہر دل میں، ہر گھر میں اِک دیپ جلانے آیا تھا

حیف! بچھائے نادانوں نے کانٹے اُس کے رستے میں
جو اللہ کی سیدھی سچی راہ دکھانے آیا تھا

ہائے اسی پر کوڑا پھینکا ، سوچ کے جی بھر آتا ہے
جو لوگوں پر عفو و کرم کا ہن برسانے آیا تھا

اس کو شاعر ، ساحر ، کاہن کہہ کہہ کر مطعون کیا
جو لوگوں کو قرآنی آیات سنانے آیا تھا

کیا کیا ظلم کیے انساں نے اس انسانِ کامل پر
جو دنیا میں انساں کو انسان بنانے آیا تھا

کیسے کیسے وار کیے ہیں، اس پر کالی راتوں نے
جو دنیا پر صبحِ درخشاں بن کر چھانے آیا تھا

دنیا سے کچھ بھی تو نہ چاہا کالی کملی والے نے
وہ تو سخی تھا، جود و سخاوت ہی فرمانے آیا تھا

اس نے بتایا امن و محبت ، عدل و اخوت کا مفہوم
بے معنی الفاظ کو وہ معنی پہنانے آیا تھا

رحمت عالم ، صلی اللہ علیہ وسلم ، اے زاہدؔ!
اہلِ جہاں کو جینے کا انداز سکھانے آیا تھا

☆☆☆☆☆☆

اداریہ

# بہارِ اولیں اور ظہورِ قدسی - فطرت کی حنابندی

عمیر الصدیق ندوی

شخص ہو یا کوئی شے ہو، قدرت نے سب کی شناخت اور ایک دوسرے سے فرق وامتیاز کے لیے نام رکھنے یا نام دینے کا شعور عطا کیا۔ اسم ہے تو مسمّٰی بھی ضروری ہے؛ مگر نام اور نام والے میں معنوی مطابقت بھی ہو تو یہ اور اچھا لگتا ہے، گو یہ ہر حال میں ضروری ہو، یہ ضروری تو نہیں، ہاں اگر نام اور معنویت کا باہم رشتہ سامنے آئے تو اور کچھ نہیں تو ذوق وذہن دونوں کو مسرت اور خوش گواری کا احساس تو ہو کر رہتا ہے، خود خالق کائنات نے اسی احساس کے خیال کی رعایت کی کہ اللہ کے اور بھی اچھے اچھے نام ہیں تو اس کو یاد کرنے کے لیے حسب موقع اور ضرورت ان ہی ناموں میں سے کسی کو چن لینا چاہیے یعنی نام اچھے ہوں تو ان کے مطلب کی اچھائی بھی سامنے رہنی چاہیے۔ یہ طریقہ فطرت کی سلامتی کی بھی دلیل ہے ورنہ جو کج فطرت ہوتے ہیں، ان کی نفسانی برائی یا بیماری اچھے ناموں کو بھی کج روی کا شکار بنا دیتی ہے: "وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ".

ان خیالات کی وجہ دراصل ماہِ ربیع الاول کے نام اور اس کی معنویت میں ایک تعلق کی تلاش ہے، 'ربیع' کا مطلب بتایا گیا کہ یہ موسم بہار کی بارش اور پیداوار ہے، فراخی اور ارزانی کا موسم بہار بھی اس مفہوم میں شامل ہے، یعنی ربیع کے ایام وہ روز وشب ہیں جو سرسبزی، شادابی، خوشبو اور پاکیزگی، نئے جوش، نئی قوت کے ساتھ جذبات کی فراخی اور مثبت خیالات کی ارزانی کی خاص دولت رکھتے ہیں، یعنی موسم بہار کا اصل کیف وحظ اس موسم ربیع کا بہترین تحفہ ہے، مختصر یہ کہ ربیع نام اور اس کے معانی میں مطابقت کامل طریقہ سے ہے۔

اب یہ محض اتفاق ہے یا واقعہ؟ اس بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اتفاقات کا اصل حسن تو تب ہی ہے جب وہ واقعات میں ڈھل جائیں۔ بہارِ اولیں یا فصل گل کا جوش وشباب ایک مسلسل روایت کا حصہ بھی کہا جاسکتا ہے؛ لیکن جب انسانیت کے موسم بہار میں ایسا سرسبد گل مل جائے جس کی نظیر نہ پہلے ہو نہ بعد میں اس کی توقع ہو تو پھر ایسے حسن اتفاق پر مبنی واقعہ کے بیان کے لیے الفاظ و پیرائے سب ناکافی ہی لگتے ہیں، چاہے ایسے پیارے خیالات، لفظوں کی راہ تلاش کرلیں کہ: ''چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکیں''؛ لیکن جب ولادت باسعادت' ظہور قدسی کی شکل میں ہوا اور اسی بہارِ اولیں کے دنوں میں ہو تو بارہا روح پرور بہاروں کی بات بھی پرانی معلوم ہونے لگتی ہے، پھر تو ایک سیرت نگار اعظم کا قلم الفاظ کے گہر یوں لٹانے لگتا ہے کہ: ''اس انتظار میں پیر کہن سال نے کروڑوں برس صرف کردیے..... چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا.....عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر وباد کی تر دستیاں.....سب اس لیے کہ یہ متاع

ہائے گراں، شہنشاہِ کونین کے دربار میں کام آئیں، ظہورِ قدسی کی صبح وہی صبحِ جاں نواز..... جب شرک وکفر کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے.....توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی''۔

سیرۃ النبیؐ کا وہ صفحہ جس کی سرخی ''ظہورِ قدسی'' ہے، دراصل سیرت نبویؐ کے بیان کی تمنا رکھنے والے ہر قلم اور ہر زبان کا ترجمان ہے، اس تمنا سے اندازہ ہوتا ہے کہ ربیع الاول کی بارش بہاراں نے انسانوں کو کیسا بے مثال اور بے نظیر گل تر عطا کیا جس نے انسان کی زندگی کو خزاں میں بدلنے والی شیطانی قوتوں کے وجود کو خاک میں مل جانے کا پیغام دے دیا، اس بہارِ جانفزا کے اکتساب کا کمال ہے کہ اس کے پرتو سے اخلاقِ انسانی کا آئینہ چمک اٹھا۔

اخلاقِ انسانی کا آئینہ چمکانے کی ضرورت تو ہر دور میں رہی ہے، اس وقت بھی جب ایوانِ کسریٰ میں آتش کدۂ فارس کی آگ بھڑک رہی تھی، جب صنم خانے بھی آباد تھے اور آزر کدے بھی؛ لیکن شیطانی قوتوں نے جو آگ اب بھڑکا رکھی ہے اور جس میں علم و ثقافت وتہذیب سب خاکستر ہوتے جاتے ہیں، اس میں چمنستانِ سعادت کی بہار ہی گمراہی اور بربادی کی دوزخ سرد کر سکتی ہے۔

اس لیے یہ محض واعظانہ درخواست نہیں، اہل خرد کے گہواروں سے اٹھنے والی صدا ہے کہ حضرت دانائے سبلؐ اور مولائے کلؐ کی سیرت سے تعلق کو شدید تر اور مضبوط تر کیا جائے، خلوت ہو، جلوت ہو، ماحول اپنا ہو، بیگانہ ہو، سننا ہو، سنانا ہو، سیرت نبویؐ کے سوا اور کوئی نسخۂ کیمیا کارگر نہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ خوبی اور خصوصیت تو قرآن مجید کی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے کوئی اور ہدایت نامہ ہے، نہ صحیفۂ سکون وطمانینت ہے، یہ بالکل سچ ہے؛ لیکن یہ بھی تو سوال ہے کہ کس ذات پاک کو، کس کے اسوۂ حسنہ کو، کس کی زندگی کے ہر پل کو قرآن کا مکمل عکس وترجمان قرار دیا گیا؟ خاتم پیغمبراں کے سوا کون ہے جس کے بارے میں کہا جا سکے کہ "کان خلقہ القرآن"؟ آپ کی سیرت یہ قرآن ہی تو ہے، معلوم ہوا کہ قاری نظر آنے والی ہستی حقیقت میں قرآن ہی ہے، تو پھر یہ نکتہ بھی سامنے رہے کہ جب قرآن مجید کے علوم ومعارف کبھی ختم ہونے والے نہیں، کبھی پرانے ہونے والے نہیں تو پھر سیرت طیبہ کے مطالعہ کی تکرار کی لذت کیسے کم ہو سکتی ہے؟ کیا خوب فرمایا ہمارے ایک اہل دل اور صاحب نظر بزرگ نے کہ: قرآن کے عجائبات علمی صورت میں لامحدود ہیں، اور ذات بابرکات کی سیرت میں یہی عجائبات عملی صورت میں ہیں، قرآن میں جو قال ہے وہی ذاتِ نبویؐ میں حال ہے۔

عربی اور دیگر عالمی زبانوں کی بات ہی کیا، خود اردو میں مطالعۂ سیرت کے ہزاروں انداز ہیں، ہر طبقہ کے لیے الگ الگ بیان کے پیرائے، یہ خود صاحبِ سیرت کا زندہ اعجاز ہے، وقت کا تقاضا پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے سیرت کے مطالعہ کو جو نوعیتیں دیں، زندگی کی رنگارنگی کی طرح حیاتِ مقدسہ کو جس تنوع کی نظر سے دیکھا اور دکھایا گیا، اس پر از سر نو توجہ دی جائے، خصوصاً دینی مدارس میں سیرتِ پاک کی اس معجزانہ قوت کا راز فاش کیا جائے کہ غبارِ راہ کو وادیٔ سینا میں فروغ کیسے بخشا گیا؟ اور یہ کہ چشم زدن میں کیسے ''ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی''۔

☆☆☆☆☆

بروتقویٰ

# دینی واصلاحی کاموں میں باہمی تعاون

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

دین کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے، اس کی دو قسمیں کی جاسکتی ہیں، ایک تو وہ حصہ ہے جو اپنی خاص ہیئت وشکل کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے اور اس کی ہیئت وشکل مطلوب ہے، اس کو ہم ''منصوص بالوضع'' کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ دینی امور ہیں جو اپنی خاص ہیئت وصورت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، مثلاً ارکان دین اور بہت سے ایسے فرائض جن کو نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے بتایا؛ بلکہ ان کی شکلیں زبانی بھی بتائیں اور خود کر کے بھی دکھلائیں، مثلاً نماز، حج، وضو وغیرہ۔

دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں نفس شے مطلوب ہے؛ لیکن بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر (اور زمانہ کے تغیر اور امت کے لیے وسعت کا خیال کر کے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شکلیں متعین نہیں کیں، صرف شے بتلادی کہ یہ مقصود ہے، یہ چیزیں خود منصوص ہیں؛ لیکن ان کی کوئی خاص وضع وہیئت منصوص نہیں، مثلاً جہاد فی سبیل اللہ، دعوت الی اللہ، علم ودین کے سلسلہ کو چلانا اور احکام کو امت تک پہنچانا، یہ سب امت سے مطلوب ہے اگر امت ان کو چھوڑ دے اور بالکل ترک کردے تو وہ گنہگار ہوگی؛ لیکن صرف یہ اعمال مقصود ہیں، ان کی کوئی خاص شکل اور طریقہ متعین نہیں کیا گیا؛ بلکہ اس بارے میں امت کی عقلِ سلیم پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان فرائض کی ادائیگی کو اس کی صلاحیتوں پر چھوڑ دیا گیا۔

غیر منصوص بالوضع کی واضح مثال لباس کا مسئلہ ہے، لباس ساتر ہو، ٹخنوں سے اونچا ہو، گھٹنوں سے نیچا ہو، تفاخر اور تکبر کا لباس نہ ہو، کوئی حرام ونا جائز مثلاً مردوں کے لئے ریشم نہ ہو، پس لباس بھی منصوص اور اس کی یہ شرائط بھی منصوص ہیں؛ لیکن لباس کی شکل، لباس کا رنگ اور اس کی قطع غیر منصوص ہیں، اسی میں امت کے لیے بہت سہولتیں ہیں، ان کو امت کی تمیز اور عقل عام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

دوسری مثال مساجد کی ہے، مساجد بھی مطلوب ہیں اور مساجد کی نظافت بھی مطلوب ہے کہ ان میں ذکر اللہ ہو اور وہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہوں، مگر ان کی کوئی خاص طرز تعمیر مطلوب نہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں مساجد مختلف وضع کی پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ مینارے اور گنبد بھی مساجد کے لیے شرائط میں نہیں تھے، ہندوستان کی مسجدوں میں دو میناروں کا رواج ہے، الجزائر ومراکش کی مساجد میں ایک مینار ہوتا ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور پہلی مسجد (بیت اللہ) کا کوئی مینار نہیں۔

اب دعوت الی اللہ کی مثال لیجیے، اللہ کی طرف اور اسکے دین کی طرف بندوں کو بلانا فرض ہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، تقریر سے ہو یا تحریر سے، علانیہ ہو یا خلوت میں، اس میں کوئی شکل معین نہیں، نوح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک میں واضح کر دیا گیا ہے کہ دعوت کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں: ''قَالَ رَبِّ أَنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَّنَهَارًا'' (حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے سامنے رات میں بھی دین کی اور توحید کی دعوت رکھی اور دن میں بھی)۔ ''ثُمَّ أَنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا'' (پھر میں نے خوب پکار کر بھی ان کو بلایا) ''ثُمَّ أَنِّي أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا'' (پھر میں نے بالاعلان بھی آپ کا پیغام ان کو پہنچایا اور چھپ چھپ کر تنہائیوں میں بھی ان سے آپ کی بات کہی)۔

لہٰذا دعوتِ دین کا کام کرنے والے ہر فرد وجماعت کو اختیار ہے کہ وہ جس ماحول میں اپنے لیے جو طریقہ صحیح جانے وہ مقرر کرے اور اپنی سعی وجہد کا جو طرز مناسب اور مفید سمجھے وہ اختیار کرے، اس میں کسی کو جائز اور ناجائز کہنے یا کوئی روک ٹوک لگانے کا حق حاصل نہیں ہے، جب تک کہ اس میں کوئی ایسا عنصر شامل نہ ہو جائے، جو شرعی طور پر منکر یا مقاصد دینیہ کے لیے مضر ہو۔

بعض عوامی حلقوں میں اس وقت ان دونوں حصوں کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے، منصوص کو غیر منصوص کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور غیر منصوص کو منصوص کے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے، اس کے نتیجہ میں مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں اور مختلف اداروں اور دعوتوں میں اکثر تنازع کی شکل پیدا ہو جاتی ہے، اگر ہم ان چیزوں میں فرق سمجھ لیں تو بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی، سینکڑوں تنازعوں کا سدباب ہو جائے گا اور بہت سی ذہنی الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔

چیزوں کی اصلی ہیئت سمجھنے اور ان کو ان کے صحیح مقام پر رکھنے کا یہ پیمانہ ہمارے ہاتھ آ گیا، اس کے بعد صحیح اصول پر چلنے والی اور مخلصانہ دینی دعوتوں، دینی اداروں اور حلقوں کے درمیان تقابل، تصادم اور اختلاف کا موقع باقی نہیں

رہتا، فرق جو رہ جاتا ہے وہ صرف اپنے اپنے تجربوں اور حالات کے مطالعہ کا ہے کہ کام کی کون سی شکل اور طریقہ زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہے اور کس سے وہ نتائج ومقاصد حاصل ہوتے ہیں، جو اس کام سے مطلوب ہیں؟ دعوت الی اللہ کی مخصوص شکل اور طرز کی افادیت وتاثیر کی وضاحت کی جاسکتی ہے؛ لیکن کسی کو اپنے تجربہ اور مطالعہ کا اس طرح پابند نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے احکام قطعیہ اور نصوص قرآنیہ کا، دین کی خدمت کرنے والی کوئی جماعت اگر کسی خاص طریقہ کار کو اختیار کرتی ہے (بشرطیکہ وہ دین کے اصول اور سلف صالحین کے متفقہ مسلک اور طرز فکر کے مخالف نہ ہو) تو وہ اپنے فیصلہ میں حق بجانب ہے، ہم اپنے مخصوص طرز کار کو دوسری دعوتوں اور دین کی خدمت کرنے والے دوسرے حلقوں کے سامنے بہتر سے بہتر طریقہ پر پیش کر سکتے ہیں؛ لیکن اگر صرف طرز کار کے فرق کی وجہ سے ہم ان کو غلط کار سمجھیں یا ان کی دینی مساعی اور مشاغل کی نفی کریں جن کو انہوں نے اپنے تجربہ اور مطالعہ اور زمانہ کے تقاضوں کے پیش نظر اختیار کیا ہے اور ان کی افادیت واقعات اور برسوں کے تجربہ سے ان پر واضح ہو چکی ہے اور کتاب وسنت اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حکمت دینی کے وسیع دائرہ میں اس کے لیے ان کے پاس شواہد ودلائل پائے جاتے ہیں، تو یہ ہماری غلطی اور زیادتی ہوگی، ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ ان سے دوبارہ غور کرنے اور نتائج کو دیکھنے اور ان کا موازنہ کرنے کی درخواست کریں؛ لیکن ان کی تحقیر وتردید کرنا اور ان کو غلط کار اور گمراہ سمجھنا غلط ہے اور خدمت دین اور دعوت الی الخیر کے دروازے کو محدود اور تنگ بنانے اور امور دین کے رشتہ کو زمانہ اور ماحول سے منقطع کرنے کے مترادف ہوگا، دعوتوں اور طریق کار میں بعض چیزیں وہ ہوتی ہیں جن کی ہمیں شریعت نے سختی کے ساتھ تاکید کی ہے، بعض انتظامی امور ہوتے ہیں جو حدیث وقرآن سے استنباط کیے جاسکتے ہیں، وہ اصولی طور سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی میں ملیں گے؛ لیکن خاص اس ہیئت میں نہیں ملیں گے، یہ سب چیزیں اجتہادی اور تجرباتی ہیں، ان چیزوں پر یا ان خاص شکلوں پر ہر جگہ اور ہر شخص سے منصوص چیزوں کی طرح اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

سب سے مشکل چیز اعتدال ہے، انبیاء علیہم السلام میں اعتدال بدرجۂ اتم ہوتا ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ پچاس برس کے بعد اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوں، جو صاحب نظر بھی ہوں اور اللہ کے ساتھ ان کا تعلق ہو اور دعوت کے طریقہ میں زمانہ کی ضروت اور تقاضے کے لحاظ سے تبدیلیاں کریں۔

اس وقت اگر ایک جامد طبقہ اس کی مخالفت محض اس بناء پر کرے کہ ہمارے بزرگ ایسا کرتے تھے تو اس کا رویہ غلط ہوگا، اس کا اصرار ہٹ دھرمی ہوگا، کبھی کبھی ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ یہی طریقۂ کار اور یہی طرز دین کی خدمت اور احیاء کے لیے ہمیشہ کے واسطے اور ہر جگہ کے لیے ضروری ہے اور اس کے علاوہ سب غلط ہے، جب تک اس مخصوص طریقہ پر کام نہ ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ ساری جدوجہد رائیگاں گئی اور جو کچھ ہوا سب فضول ہوا، یہ بے اعتدالی ہے اور یہ رویہ خطرناک ہے، اسی طرز فکر کے نتیجے میں مختلف مذاہب اور فرقے امت میں پیدا ہوئے، اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ اب تک غور اور تجربوں نے ہمیں یہاں تک پہنچایا اور ہم نے اس کو مفید پایا ہے، پس جب تک یہ چیزیں فائدہ مند معلوم ہوتی ہیں ہمیں اس وقت تک ان کو جاری رکھنا چاہیے؛ لیکن اگر کوئی خاص طریقہ ایک رسم بن جائے تو یہ ایک مذہب بن جائے گا اور ایک بدعت قائم ہو جائے گی اور اس وقت کے ربانی مصلحین کا فرض ہوگا کہ اس کی اصلاح کے لیے جدوجہد کریں اور ان رسومات کو مٹائیں، بہت سی چیزیں صحیح مقاصد اور دینی مصلحتوں سے شروع ہوتی ہیں؛ لیکن آگے چل کر غلط صورت اختیار کر لیتی ہیں، ایسے موقع پر حقیقت ورسم، سنت وبدعت، فرض ومباح میں تمیز کرنا تفقہ فی الدین ہے اور کہنے والے نے کہا کہ:

گر حفظِ مراتب نکنی زندیقی

انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت وتربیت اور ان کی مساعی جمیلہ کے لیے (جن کی پشت پر تائید ربانی اور ارادۂ الٰہی ہوتا ہے) جہاں مضر اور ایک طرح سے حریف ورقیب کفر، الحاد، غفلت ومعصیت ہے جو ان کے پیروؤں کو ان کی دعوت کے برکات اور ان کی تعلیم وتربیت اور تبلیغ ودعوت کے اثرات سے محروم کرنے کا کام انجام دیتی ہے وہاں ''بے روح رسمیت'' بھی ہے، اول الذکر طاقتیں اگر بیرونی دشمن کی حیثیت رکھتی ہیں، جو باہر حملہ آور ہوتا ہے تو یہ اندرونی بیماری ہے جو گھن کی طرح اس جماعت کو لگ جاتی ہے (جو ان کی تعلیم ودعوت سے پیدا ہوتی ہے) اور اس کو اندر اندر کھوکھلا کر دیتی ہے، اس کے نتیجہ میں عقائد بے اثر اور اعمال وعبادت بے روح اور بے نور بن جاتے ہیں، وہ ایک رسم کی طرح ادا کیے جاتے ہیں، ان میں نفس وماحول کی ترغیبات اور شیطان کی تسویلات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہتی

اوران کی کیمیا اثری اور انقلاب انگیزی جاتی رہتی ہے، یا بہت کمزور ہو جاتی ہے، یہ عموماً نتیجہ ہوتا ہے مؤثر وصحیح دعوت وتربیت کے فقدان یا انقطاع کا، یا مؤثر اصلاحی وتربیتی شخصیتوں سے محرومی کا یا ایسے مواقع اور میدانوں کے صدیوں تک پیش نہ آنے کا جن میں شرکت سے ایمان میں تحریک پیدا ہوتی ہے، دلوں کے زنگ دور ہوتے ہیں اور نفس کی مخالفت کی طاقت اور ایثار وقربانی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، اسی وقت کوئی دعوت وتحریک (الہامِ ربانی اور انتظام خداوندی سے جو اس دین کا ہمیشہ سے رفیق رہا ہے) سامنے آتی ہے، جو اس 'رسمیت' پر ضرب لگاتی ہے، دلوں کا زنگ دور کرتی ہے، امت کو صورت سے حقیقت اور 'رسمیت' سے ایمان واحتساب کی کیفیت کی طرف لاتی ہے، اسلام میں تجدید واصلاح کی تاریخ اور مجددین، مصلحین کے مستند تذکروں کے مطالعہ سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا نشانہ یہی 'رسمیت' تھی جو مسلم معاشرہ میں سرایت کر چکی ہوتی ہے اور دیمک کی طرح اس کے سرسبز وشاداب درخت کو چاٹ چکی ہوتی ہے اور امت بعض اوقات "وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ" (اور جب تم ان (کے تناسب اعضاء) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمہیں (کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں اور جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو تم ان کی تقریر توجہ سے سنتے ہو (مگر فہم وادراک سے خالی) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں) کا ایک حد تک نمونہ بن جاتی ہیں، وہ ہدایت خداوندی اور کتاب وسنت کے عمیق ومخلصانہ مطالعہ کے اثر سے کوئی ایسی دعوت یا طریق کار پیش کرتے ہیں، جس سے اس 'رسمیت' کا پنجہ ڈھیلا ہو جاتا ہے، جسم امت میں ایک نئی روح، ایک نئی ایمانی کیفیت، رضاء الٰہی کے حصول کا ایک زندہ وتازہ جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسکی قوت عمل بڑھ جاتی ہے، اس کو بڑی سے بڑی قربانی آسان معلوم ہونے لگتی ہے اور بعض اوقات قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرنے والے واقعات سامنے آتے ہیں اور ایمان کی روح پرور بادِ بہاری کے جھونکے آنے لگتے ہیں۔

خود اس اصلاح ودعوت اور اس طریق کار میں مرورِ زمانہ سے 'رسمیت' دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے اور جو چیز رسم کو مٹانے اور دل ودماغ کو جگانے کو آئی تھی وہ بھی اپنی روح، اندرونی جذبہ اور تازگی کھو دیتی ہے اور ایک 'رسم' ضابطہ اور Routine بن کر رہ جاتی ہے اور اسی کو خود ایک نئی اصلاح ودعوت اور ایک طاقتور شخصیت کی ضرورت پیش آجاتی ہے جو اس خواب آلودہ اور لکیر کے فقیر کے نظام اور طریق کار کی اصلاح کرے اور اس میں جو بدعات، مفاسد، غلو اور جمود پیدا ہو گیا ہے، اس کو توڑے اور اس معاشرہ میں کسی اور طریقہ سے جو کتاب وسنت سے ماخوذ اور اصول ومقاصد کے مطابق ہو معاشرہ کی 'رسمیت' کو دور کرے ایمان و ایثار اور قوت عمل پیدا کرے۔

اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے جو ایک لطیفہ کی حیثیت ہے؛ لیکن اس سے بڑا سبق حاصل کیا جاسکتا ہے، راقم السطور کے ایک فاضل دوست نے بتایا کہ دریا کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے ان کے کتب خانہ میں جلد جلد دیمک لگ جاتی تھی اور قیمتی کتابیں تلف ہو جاتی تھیں، وہ پریشان تھے کہ اس کا کیا علاج کریں، ایک تجربہ کار دوست نے بتایا کہ اگر اونٹ کی ہڈی اس کتاب خانہ میں رکھ دی جائے تو دیمک نہیں لگے گی، انہوں نے بڑی مشکل سے اونٹ کی ہڈی حاصل کی؛ لیکن ان کی حیرت وپریشانی کی کوئی حد نہ رہی جب انہوں نے ایک دن دیکھا کہ اونٹ کی اس ہڈی میں خود دیمک لگ گئی۔

یہاں ایک باریک بات سمجھ لیں وہ یہ کہ ایک نبی ہوتا ہے اور ایک مجدد اور ایک مصلح ہوتا ہے، نبی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے طریقہ کے بغیر نجات ہی نہیں ہوسکتی اور اس کی ہدایت حاصل کیے بغیر اللہ کی رضا اور کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی، اس میں کسی قسم کی مداہنت یا تساہل کی گنجائش نہیں ہے؛ لیکن مجددین اور مصلحین کا معاملہ یہ نہیں ہے، ہر مجدد اور ہر ربانی مصلح کی پیروی سے دین کو اور دین کے طالبوں کو نفع پہنچتا ہے، مثلاً کسی مجدد کے طریقہ سے قربانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا اس کے اثر سے انفاق وایثار کے جذبات پیدا ہوں گے، ایک دوسرے مجدد کے طریقہ سے اخلاق کی اصلاح اور صفائی معاملات کا اہتمام پیدا ہوتا ہے، تو اس سے تعلق ووابستگی خاص طور سے اس میں مؤثر ہوگی۔

بہر حال نبی کے طریقہ پر نجات کا انحصار ہوتا ہے اور بالکل اسی طریقہ پر چلنا لازم؛ لیکن کسی مجدد ومصلح کا معاملہ نہیں، خاص خاص ترقیاں تو ان کی اتباع اور وابستگی سے ہوتی ہیں؛ لیکن نجات اس پر منحصر نہیں ہوتی۔

ایک بات یہ بھی جاننی چاہیے کہ امت میں طبقات کا اتنا اختلاف ہے اور اذہان کا اتنا تفاوت ہے اور حالات ایسے مختلف ہیں کہ کوئی دعوت و تحریک اور کوئی اصلاحی جدوجہد یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ تمام طبقات کو متاثر کرسکتی ہے اور ان کی تسکین کا سامان کرسکتی ہے اور ان کی استعداد کے مطابق دینی غذا فراہم کرسکتی ہے۔

کوئی ذہن تقریر سے متاثر ہوتا ہے، کسی پر

لٹریچر اثر انداز ہوتا ہے اور کوئی کسی دوسرے ذریعہ سے متاثر کیا جاسکتا ہے، اسی طرح واحد طریقہ کار سے ہر جگہ، ہر ماحول میں اور ہر حالت میں کامیابی مشکل ہے، اس حقیقت کو نہ سمجھنے اور اس کے مطابق نہ چلنے سے لوگوں سے بڑی غلطیاں ہوتی ہیں، بہت سے لوگ قابل قدر اور بڑے مخلص ہیں؛ لیکن ان لوگوں کا اس وقت تک دل خوش نہیں ہوتا جب کہ ہر شخص اسی مخصوص طرز پر کام نہ کرے جس کو اس نے اختیار کیا ہے، حالانکہ عمومی اصلاحی وانقلابی تحریکوں و دعوتوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا، وہاں ہر چیز اس کے صحیح مقام پر رکھی جاتی ہے اور ٹھیک چوکھٹے میں بٹھائی جاتی ہے، ہر شخص سے وہی کام لیا جاتا ہے جس کا وہ زیادہ اہل ہو اور اس میں دوسروں سے ممتاز ہو اور جس کو دوسروں سے بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہو، یہ اللہ کی طرف سے انتظام سمجھنا چاہیے کہ کچھ لوگ اس راستہ سے دین تک آجائیں اور کچھ اس راستہ سے آجائیں، اپنے طریق کار کا مناسب طریقہ سے ان کے سامنے اکثر بیشتر تذکرہ کرتے رہنا چاہیے؛ لیکن اس طرح نہیں کہ اس میں دین کے دوسرے کاموں اور دینی واصلاحی مساعی کی نفی اور تحقیر ہوتی ہو اور راخلاص سے کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور انہیں مایوسی اور بددلی پیدا ہو، اس طرح امت کے مختلف طبقات اور جماعتوں میں تعاون علی البر والتقوی کی روح بیدار ہوگی جو عرصہ سے مفقود ہو چکی ہے اور جس کی اس زمانہ میں - جب کہ باطل مختلف شکلوں میں اور نت نئے حربوں کے ساتھ حملہ آور ہے اور اہل باطل مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ (ہر ٹیلا اور ٹاپو سے ابلے چلے آرہے ہیں)- سخت ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

# صلاح وہدایت کا حامل ممتاز انسانی معاشرہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

ان حالات میں خاتم الرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلط عقائد وخیالات کی پرزور نفی کی اور بہیمانہ ووحشیانہ زندگی کی زبردست مخالفت کی، ظلم وفساد کو ختم کیا، انسانیت کو اس کی پستی سے اٹھایا، ندائے حق بلند کی اور پھر اس کے نفاذ کے لیے کھڑے ہوئے، کچھ نے شروع ہی میں ساتھ دیا، کچھ شدید مخالفت پر آمادہ ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار اصحابؓ پر جان لیوا مظالم کیے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ نے یہ سب کچھ اللہ کے راستہ میں سہا، جمے اور ڈٹے رہے، دعوت وتبلیغ کرتے رہے کہ حق سربلند ہو اور باطل سرنگوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بگاڑ اور فساد کو ختم کرنے اور ضلالت وانحراف کو دور کرنے کے لیے جہد مسلسل سے کام لیا اور انسان کو بتایا کہ وہ اپنے رب کی کس طرح بندگی کرے اور اپنے ماں باپ کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرے، پڑوسیوں کے ساتھ کیسے رہے، رشتہ داروں، دوستوں اور تعلق والوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرے، چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ کس رحم دلی اور شفقت و محبت سے پیش آئے، بڑوں اور اپنے ذمہ داروں کا کیسا لحاظ وخیال کرے، اور یہ تعلیم دی کہ بنی نوع انسان میں کوئی کسی سے برتر نہیں ہے، سارے انسان برابر ہیں، سب آدمی ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں، عرب ہوں یا عجم، نہ عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت وترجیح ہے، اور نہ گوروں کو کالوں پر اور نہ کالوں کو گوروں پر، ہاں اگر ہے تو صرف تقویٰ وطہارت کی بنیاد پر ہے، اور یہ بتایا کہ وہ اشرف المخلوقات ہے؛ لیکن دوسری مخلوق کے ساتھ بھی اس کا معاملہ شفقت ونرمی اور نفع رسانی کا ہونا چاہیے: " ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء ". [ابوداؤد] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لازوال ارشاد وتعلیم ہے، اور یہ کہ: " الخلق کلهم عیال اللّٰه فأحب الخلق الی اللّٰه من أحسن الی عیاله " . [طبرانی] (ساری مخلوق اللہ کی زیر پرورش ہے، اللہ کی مخلوقات میں اللہ کو سب سے پسند وہ ہے جس کا رویہ اس کے زیر پرورش مخلوق کے ساتھ اچھا ہو)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جہد مسلسل وسعی پیہم تقریباً نصف صدی جاری رہی، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا مثالی انسانی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کردیا کہ اس کے جیسا روئے زمین پر کبھی دیکھا نہیں گیا تھا، اس معاشرہ کا ہر فرد عقیدہ وعمل میں اپنی مثال آپ تھا، یہ ممتاز انسانی معاشرہ صلاح وہدایت کا حامل معاشرہ تھا، اس معاشرہ کے افراد انسانی فضائل کے داعی و ناشر تھے اور ہر معاشرے کو اخلاقی زوال سے صاف کردینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے تھے۔

☆☆☆☆☆

اسوۂ حسنہ

# علمی، دینی اور تربیتی سرچشمہ

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ربیع الاول کا مہینہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے جشن بہاراں ہے، وہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو بیان کرنے کے لیے متنوع پروگراموں کو ترتیب دیتے ہیں، اور اس عظیم شخصیت کی مدح وستائش کرتے ہیں، جن کی آمد پورے عالم کے لیے باعث رحمت، اور جن کی بعثت سرچشمۂ ہدایت ہے، اور ان پر لاکھوں کروڑوں درود وسلام پیش کرتے ہیں۔

تمام انبیاء اور رسولوں کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب سے اخیر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا، تاکہ قیامت تک آنے والے انسانوں تک انسانیت کا پیغام پہنچایا جائے، اور یہ باور کرایا جائے کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں، قیامت کے روز جبکہ نفسی نفسی کا عالم ہوگا، اور ہر ایک انسان اللہ کے برگزیدہ اور نیک بندوں کی شفاعت کا محتاج ہوگا، اس وقت شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم بن کر اللہ تعالیٰ کی اجازت سے تمام اہل ایمان کی شفاعت فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِه" (کون ایسا ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کرسکے)۔[البقرہ:۲۵۵]

مسلمانوں میں بعض گروہ ایسے ہیں جو حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت زیادہ اظہار کرتے ہیں، لیکن وہ ذکر اللہ، خشیت الٰہی، تضرع اور انابت سے بالکل عاری ہوتے ہیں، معاملات کو حل کرنے میں اللہ تعالیٰ کو مشکل کشا تصور نہیں کرتے، سنت نبوی کو فراموش کر کے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ماہِ ربیع الاول میں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ان کی معراج کے لئے کافی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے لسانِ نبوت سے یہ کہلوادیا: "قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَاللهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" [آل عمران:۳۱] (آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا، اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے)۔

موت وحیات، سرور وحزن، فقیری وتونگری، قلت وکثرت ہر حال میں اطمینان قلب کے ساتھ اللہ پر ایمان لانا، فرائض وواجبات، سنن ونوافل ان تمام چیزوں میں نبوی طریقہ سے آراستہ ہونا ہی مردِ مؤمن کی شان ہے، اس کی دنیا وآخرت کی سعادت وکامیابی اور فلاح وبہبود کا ضامن ہے، آدمی خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم نبوی تعلیمات سے کسی حال میں مستغنی نہیں ہوسکتا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو منجانب اللہ یہ حکم ہوا تھا کہ وہ تمام لوگوں میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیں: "يَا أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ" [المائدۃ:۶۷] (اے (ہمارے) پیغمبر! جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے یہ (سب) آپ (لوگوں تک) پہنچا دیجیے، اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں۔

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِه وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" [الاحزاب:۴۵-۴۶] (اے نبی! بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے بطور گواہ اور بشارت دینے والے اور ڈرانے والے کے اور اللہ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والے کے، اور بطور ایک روشن چراغ)۔

سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت و بلندی کو عرب وعجم کے بہت سے شعراء نے بیان کیا ہے، انہوں نے خدمت دین سمجھ کر مدح رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا نعت نبوی کے باب میں اپنی زبان وقلم کی جولانیاں دکھائیں، اور امت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا تذکرہ کیا، سب سے پہلا طبقہ مخضرم شعراء کا تھا جو عہد جاہلی اور عہد اسلامی دونوں عہد میں رہا۔ انہوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روز وشب کے معمولات دیکھے، اور اسلام کی تعلیمات پر بھی نظر ڈالی تو وہ اسلام کے حلقے میں داخل ہوگئے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وناموس کے دفاع میں سینہ سپر ہوگئے، کئی ایسے مواقع ہیں، جن میں انہوں نے کفار قریش کو للکارا، اور اسلام کی بہترین ترجمانی کی، ان میں ایک نمایاں نام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں اسلامی خلافت پوری دنیا کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ کے طور پر سامنے آئی، پھر آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے اس عظیم منصب کو سنبھالا، جنہوں نے نبوی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے خلافت کی اس عظیم ومقدس ذمہ داری کو نبویؐ تعلیمات کی روشنی اور عملی اقدامات کے ساتھ، نیز

تہذیب وتربیت کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بحسن وخوبی انجام دیئے، اور دنیا کے سامنے ایک بہترین مثال کردی، اس امانت داری اور دیانت داری، اور ''حق بحق دار می رسد'' کے اصول پر عمل کرنے کی بنا پر تمام انسانی معاشرہ اس سے متأثر ہوا، یہاں تک کہ اس وقت کی سپر پاور طاقتیں ایران وروم اور دوسرے قبیلے اور خاندان اسلام کی آغوش میں آنے لگے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک وبت پرستی اور لوگوں کے ذہنوں میں پیوست نسلی، وطنی، قومی تعصّبات کو ختم کرنے اور باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے غیر معمولی کوششیں کیں، کیونکہ یہی تعصّبات اور تفریق کی ذہنیت اُن لوگوں کی شقاوت وبدبختی کا اصل سبب تھا، اور اس ناپاک ذہنیت کے حامل اس وقت کے تقریباً قبیلے اور خاندان تھے، بہرحال جاہلی تاریخ میں ان تمام تر واقعات کی بڑی لمبی فہرست موجود ہے، جیسا کہ علما اور مؤرخین اس سے بخوبی واقف ہیں، دعوتِ اسلام کی حقیقت اس واقعہ سے مزید واضح ہوجاتی ہے، جس میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت ربعی بن عامرؓ نے ایمانی کیفیت سے سرشار ہوکر ایرانی بادشاہ کو جرأتمندانہ جواب دیا تھا، جب اُس نے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیوں آئے؟ تمہیں یہاں کس نے بھیجا؟ تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ ہمیں اللہ نے بھیجا ہے، اور ہمارا کام یہ ہے کہ بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کی طرف لے آئیں، اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت وکشادگی سے روشناس کرائیں، نیز دنیا میں موجود ادیان ومذاہب کے ظلم وستم سے بچا کر اسلام کے عدل وانصاف کے سایہ میں لا کھڑا کریں۔

یہی وہ علمی، دینی اور تربیتی سرچشمہ ہے، جس سے صحابہ کرامؓ خوب خوب سیراب ہوئے، اور یہی وہ مضبوط بنیاد اور اساس ہے، جس پر صلح وآشتی، امن وامان کی داعی اور عدل وانصاف پر مبنی شاندار خلافتِ اسلامیہ کی عمارت قائم ہوئی، اس خلافت نے مختصر سے عرصہ میں دنیا کے گوشہ گوشہ میں توحید ورسالت کا علم بلند کردیا، اور صحابہ کرامؓ نے حکومت وسیاست کے میدان میں ایک بہترین مثال دنیا کو دے دی، اور انہوں نے فیضانِ نبویؐ سے علمی، دینی وروحانی فیض حاصل کیا، جس کے نتیجے میں وہ بلند اقدار اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے حامل بن گئے، اور قول وفعل، نصیحت وموعظت، اخلاص وللّٰہیت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، نیز علم وادب، ایمان ویقین اور جسم وروح میں جامعیت وہمہ گیریت جیسے بلند اوصاف سے متصف ہوتے چلے گئے، اور قرآنِ کریم نے اسی کی منظر کشی کی ہے: ''وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْداً'' (اسی طرح نے ہم آپ کو امتِ وسط بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسولؐ تم پر گواہ بنیں)۔ اُس وقت دنیا میں بسنے والے تمام لوگوں کے لیے بالکل واضح ہوگئی کہ اصل مذہب تو صرف دینِ اسلام ہے، جو کہ کامل ومکمل دین ہے، اور انہیں اس بات کا بھی علم ہوگیا کہ وسطیت واعتدال اور میانہ روی ہی اس دین کا لازمہ اور خصوصیت ہے، اور اس دین کا مابہ الامتیاز ہے۔

مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ہی اپنے اس دینِ کامل اور اُس کے ذریعہ ملنے والی عزت ونصرت، شوکت وسطوت اور باطل پر حق کے غلبہ پانے کی حقیقت سے غافل ہوگئے، اسی طرح وہ افراط وتفریط کا شکار ہوگئے، جس کی بنا پر وہ زندگی کے ہر موڑ پر ناکام اور زندگی کے ہر میدان میں پسماندگی کا شکار ہوتے چلے گئے، اور وہ کامیابیوں کے نشان سے دور ہوتے جارہے ہیں، نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ وہ مادی قومیں جن کے پیشِ نظر صرف اور صرف وقتی خواہشات ہوتی ہیں، حرص وہوس ہوتی ہیں، اُن کو لقمہ تر اور نوالہ بنانے کے درپے ہیں، ان کی بیخ کنی کی تیاریاں کررہی ہیں، جب کہ ان قوموں کی کوئی قابل ذکر تاریخ نہیں، اور ان کی شقاوت وبدبختی اور حرماں نصیبی کا یہ حال ہے کہ وہ اُن تمام تر نعمتوں، نوازشوں اور سعادتوں سے محروم ہیں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے، اور ان کو ساری انسانیت کا رہبر ومقتدا قرار دیا، بلکہ قرآنِ مجید میں ان کی امت کو خیر امت سے یاد کرکے ساری امتوں اور قوموں پر اس کی فضیلت وبرتریت ثابت کردی۔

کسی بھی زمانہ میں کسی انسان کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اس بلند مقام ومرتبہ کو صحیح انداز میں بیان کردے، جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا، خواہ اس کا مطالعہ کتنا ہی وسیع ہو، حالانکہ شعرائے اسلام نے اس بلندی کی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے اشعار میں آپ کی شایانِ شان مدح سرائی سے قاصر رہے۔

لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں کچھ ایسے افراد ہوتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ میں تنقیص کی ناکام کوشش کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ، رسول، ملائکہ اور تمام مخلوقات کی لعنت برستی ہے، اور قریب ہے کہ ایسے لوگوں پر اللہ کا عتاب نازل ہو، جیسا کہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

انسان کامل

# انسانیت کی مسیحائی

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

جولوگ دنیا کی تاریخ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ دنیا کے لیے سب سے مبارک دن وہ تھا جس دن رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے، تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کی دنیا انسانوں کی دنیا نظر نہیں آتی، وہ کہیں درندوں کی دنیا نظر آتی ہے، تو کہیں انسان نما جانوروں کی دنیا نظر آتی ہے، اس وقت کی دو متمدن حکومتیں رومن امپائر (Roman Empire) اور پرشین امپائر (Persian Empire) جن کا دبدبہ تھا، ان کا تمدن کیا تھا؟ ایک سڑا ہوا لاشہ تھا جس کی بدبو سے اس وقت کی پوری دنیا پریشان تھی، ان دونوں متمدن حکومتوں کی تاریخ دیکھ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ انسان گرتا ہے تو جانوروں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے، اس کی عقل لذت اندوزی کے لیے ایسے ایسے ظالمانہ طریقے اختیار کرتی ہے جس کی طرف کسی ایسے انسان کا ذہن بھی نہیں جاسکتا جس کے پہلو میں دھڑکتا ہوا دل ہو، اس تیرہ و تاریک دنیا میں انسان بھٹک رہا تھا، اس کو زندگی کا سرا نہیں مل رہا تھا اور نہ کہیں امید کی کرن نظر آرہی تھی اور لگتا تھا کہ شاید دنیا اپنی تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے اور اس کے پیدا کرنے والے نے اس کو فنا کردینے کا ارادہ فرمالیا ہے، لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا، دنیا کو اپنا نیا سفر شروع کرنا تھا، اس کو ترقی کے بلند ترین معیار تک پہنچنا تھا اور وہ انسانیت جو شرمسار کھڑی تھی اس کا سر فخر سے بلند ہونا تھا، علوم وفنون کی گتھیاں سلجھنی تھیں اور جابجا علم کی قندیلیں روشن ہونی تھیں، بے بسوں اور کمزوروں کو ان کا حق ملنا تھا اور عورت جو سر بازار رُسوا ہورہی تھی اس کو اپنا مقام حاصل ہونا تھا، دنیا کے جہنم کدہ کو جنت کدہ میں تبدیل ہونا تھا کہ مکہ کی گھاٹیوں سے آفتابِ نبوت طلوع ہوا، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا تشریف لائے بہار آگئی، جو لب مسکرانے کے لیے ترس گئے تھے ان پر مسکراہٹ آئی، جو دل ان حالات کو دیکھ کر مسوس مسوس کر رہ جاتے تھے ان کی کلی کھل گئی، یہ خوشبو ایسی پھیلی کہ ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی کہ دنیا کا ہر حصہ معطر ہوگیا، باد خزاں کے بعد بہار کا دور آیا، بادسموم کے بعد بادِ نسیم کے ایسے دل نواز جھونکے چلے جنہوں نے مشام جان کو تازگی بخشی، مردہ دلوں کی مسیحائی کی اور انسانوں میں انسانیت کی بہار آگئی۔

علم کی یہ خوشبو جو حجاز کی مبارک سرزمین سے چلی تو اس نے کیا ایشیا اور کیا یورپ و امریکہ، ملک ملک کو معطر کیا اور لوگوں نے سکون کی سانس لی، مگر ان ہی انسانوں میں وہ درندہ صفت لوگ بھی تھے جن کی عادت خون چوسنے کی تھی، جن کا کام ہی اپنی راحت، لذت اور عزت کے لیے دوسروں کی عزتیں لوٹنا اور ان کو ستانا تھا، ان کو یہ عدل وانصاف ایک آنکھ نہ بھایا اور پہلے دن سے انہوں نے اس عادلانہ نظام اور رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طرح طرح سازشیں شروع کیں، یہ سلسلہ پہلے دن سے چلا اور مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آج دنیا کی نام نہاد متمدن ملکوں کی شکل میں موجود ہے جن کے پاس اسی رومن اور پرشین کلچر کی دہائی ہے۔

اسلام نے اس تمدن کو جس طرح تراش خراش کر سجایا تھا اور اس کی غلاظتیں صاف کی تھیں اور اس کو نکھارا تھا اور اس میں طرح طرح کے پھول سجا کر ایسا حسین گلدستہ دنیا کو دیا تھا جس کا تصور اس سے پہلے دنیا نہیں کرسکتی تھی، یہ نام نہاد متمدن قومیں نہیں چاہتیں کہ عدل وانصاف کی اس خوشبو کو باقی رکھا جائے، ان کا منشا صرف یہ ہے کہ ان کی طاقت باقی رہے، ان کا سکہ چلتا رہے، اس کے لیے قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک بھی تباہ ہوتے چلے جائیں، اس کی ان کو کوئی پرواہ نہیں۔

آج جو کچھ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے خلاف کہا یا لکھا جارہا ہے، یہ اسی کینہ کا نتیجہ ہے جو ان درندہ صفت انسانوں میں پہلے دن سے موجود تھا اور آج اس کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں جو ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے اندر دھڑکتا ہوا دل اور انسانیت کا درد رکھتی ہے، اس کے سامنے جب انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونۂ انسانیت پوری سچائی کے ساتھ آتا ہے تو ان کے دلوں کی کیفیت بدلنے لگتی ہے اور ایک پیاس محسوس ہونے لگتی ہے جو صرف اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آب زُلال سے بجھتی ہے، آج ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ ہم ایک طرف سیرت طیبہ کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کریں اور ایک ایک فرد تک اس کو پہنچائیں اور خود اس مبارک اُسوہ کو سامنے رکھ کر اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق کرنے کی کوشش کریں، تاکہ علم وعمل کی دعوت دنیا تک پہنچے، حقیقت اور سچائی کے جاننے والوں کو ان کی غذا مل سکے اور تاریک دنیا میں جگہ جگہ علم وعمل، عدل وانصاف اور امن وامان کی قندیلیں روشن ہوں!

☆☆☆☆☆

علم ودین

# تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اسلام سے پہلے مختلف قوموں میں عورتوں کو میراث نہیں ملتی تھی، ان کا خیال تھا کہ جو لوگ دشمن سے پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں اور قوم کی حفاظت اور مدافعت کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں، ان ہی کو میراث پانے اور خاندان کی املاک میں حصہ دار بننے کا بھی حق حاصل ہے، غرض جسمانی طاقت اور مقابلہ کی قوت کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اسی کو قوموں کی سربلندی کا راز اور غلبہ واقتدار کا وسیلہ تصور کیا جاتا تھا اور بڑی حد تک زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ بات درست بھی تھی؛ لیکن آج حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور اب قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ کی للکار اور شمشیر وآہن کی جھنکار کے بجائے علم وتحقیق کے مراکز اور دانش گاہوں سے متعلق ہوگئی ہے۔

جو قوم علم وفن سے عاری اور فکر ودانش سے محروم ہو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی تعداد رکھتی ہو؛ لیکن اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کی ہے، جو ہمیشہ پاؤں تلے روندی اور قدموں کے نیچے بچھائی جاتی ہے، اس کی ایک کھلی ہوئی مثال جاپان اور خود ہمارا ملک ہندوستان ہے، ہم آبادی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہیں اور ہمارے ملک کا رقبہ بھی کچھ کم نہیں، قدرتی وسائل جتنے اس ملک کو میسر ہیں، کم ہی اس کی مثال ملے گی، جاپان آبادی کے اعتبار سے بھی اور رقبہ کے اعتبار سے بھی ہم سے بہت چھوٹا ملک ہے، قدرتی وسائل میں بھی وہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا؛ لیکن آج ہم کو جاپان کے سامنے دست سوال پھیلانا اور کشکولِ گدائی بڑھانا پڑتا ہے، یہ صورت حال محض علم و دانش کی طاقت کا ادنی کرشمہ ہے!

اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی آمد کے اول دن سے علم پر زور دیا ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جس سماج میں پیدا ہوئے اور نبوت سے سرفراز کیے گئے، اس میں کیا کچھ برائیاں اور کوتاہیاں نہیں تھیں؟ شرک عام تھا، سینکڑوں دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، طاقت کی حکمرانی تھی، نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال اور نہ عزت وآبرو، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات نہیں تھی جو سماج میں نہ پائی جاتی ہو، بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ان حالات میں انسانیت کے نام اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام توحید خداوندی کی دعوت اور شرک وبت پرستی کی تردید کا آنا چاہئے تھا کہ اسلام کی پوری تعلیم کا لب لباب اور خلاصہ یہی خدا کی وحدانیت کا تصور ہے، یا پھر پہلی وحی ظلم وجور کی مذمت اور عدل وانصاف کی ترغیب کی بابت ہونی چاہئے تھی؛ کیوں کہ انسان سب سے زیادہ ضرورت مند ایسے سماج کا ہوتا ہے جو پُر امن ہو، ظلم وزیادتی سے محفوظ ہو اور بقاء باہم کے اُصول پر قائم ہو؛ لیکن غور فرمائیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں صراحتاً ان باتوں کا کوئی ذکر نہیں؛ بلکہ فرمایا گیا کہ اپنے رب کے نام سے پڑھئے جو تمام کائنات کا خالق ہے، یعنی سب سے پہلے پیغمبر کے ذریعہ انسانیت کو جس بات کی دعوت دی گئی وہ ”تعلیم“ ہے؛ کیوں کہ علم ایسا سرچشمہ ہے، جس سے تمام بھلائیاں پھوٹتی ہیں اور تمام مفاسد کا مداوا ہوتا ہے، اسی لئے امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم روشنی ہے: ”العلم نور“۔

اگر کوئی مکان اندھیرا ہو تو اس میں چور اور ڈاکو کا داخل ہونا بھی آسان ہوتا ہے اور وہ سانپ کیڑوں کی بھی آماجگاہ بن جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ الگ الگ دشوار ہے؛ لیکن چراغ جلا دیا جائے اور مکان روشن ہو جائے، تو نہ چور اور ڈاکو کو گھر میں آنے کا حوصلہ ہوگا، نہ سانپ کیڑے اس مکان کو اپنا ٹھکانہ بنائیں گے، علم کو روشنی کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہر برائی کو الگ الگ دور کرنا اور ان کا علاحدہ علاحدہ مقابلہ کرنا آسان نہیں؛ لیکن تمام برائیوں اور مفاسد کا اصل سرچشمہ جہالت اور علم سے محرومی ہے، کسی سماج میں جب علم کی روشنی آجائے، تو خود بخود سماج کی برائیاں دُور ہوں گی اور علم ودانش کی آگ ان کو پھونک کر رکھ دے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اتنا پاس ولحاظ تھا کہ مکہ میں ہر طرح کی دشواری کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”دارِ ارقم“ کو تعلیم وتربیت کا مرکز بنایا اور اول دن سے اپنے رفقاء کی تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ رہے، مکہ کا جو لُٹا پٹا قافلہ مدینہ آیا اس میں سینکڑوں بے گھر ودر تھے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ذاتی مکان میسر نہیں تھا اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر میں مہمان تھے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اپنے لیے گھر کی فکر کی اور نہ اپنے ان ساتھیوں کے لیے، جو مستقل اقامت گاہ سے محروم تھے؛ بلکہ سب سے پہلے مسلمانوں کے لئے ایک عبادت گاہ اور دینی مرکز کی حیثیت سے ”مسجد نبوی“ کی تعمیر فرمائی اور پہلی باضابطہ درسگاہ ایک چبوترہ کی شکل میں قائم کی، جسے ”صفہ“ کہا جاتا تھا، یہی چھوٹی سی جگہ جزیرۂ عرب کے کونے کونے سے آنے والے مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا مرکز تھی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے منتظم اور استاذ تھے،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ مسلمان گھر بار اور دوسرے اسبابِ آسائش سے بڑھ کر اپنے بچوں کی تعلیم پر اولین توجہ دیں کہ جو قوم اپنا گھر پھونک کر علم کا چراغ جلانا نہ جانتی ہو، سربلندی و درخشانی کبھی اس قوم کے حصہ میں نہیں آسکتی۔

اگر تاریخ کے عجوبہ اور حیرت انگیز واقعات کو جمع کیا جائے تو اس میں ایک یہ بھی ہوگا کہ غزوہ؟ بدر میں ستر اہل مکہ مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار کئے گئے، اس وقت مسلمان سخت معاشی مشکلات سے گزر رہے تھے، نہ ان کو معقول غذا میسر تھی، نہ ضرورت کے مطابق لباس تھا اور نہ مناسب رہائش گاہ، اور تو اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہفتوں چولہا سلگنے کی نوبت نہ آتی تھی، اس عہد میں شاید ہی کوئی مسلمان گھر ہو جو فاقہ مستی کی لذت سے ناآشنا رہ گیا ہو، یہ موقع تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فدیہ کے طور پر اہل مکہ سے زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کر لیتے اور مدینہ کی معیشت کو سہارا دیتے۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اسیرانِ بدر کا فدیہ یہ بھی مقرر کیا کہ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل میں اُمت کے لیے اُسوہ ہے کہ گو ہمیں بھوکے رہنا پڑے، ہماری کروٹیں فاقوں سے بے سکون ہوں اور دنیا کے اسبابِ راحت ہمیں کم سے کم میسر ہوں؛ لیکن ہر قیمت پر ہم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کو اولیت دیں اور تعلیم سے محروم کر کے ہم ان کے اور پوری قوم کے مستقبل کو ضائع نہ ہونے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ اسلام نے تعلیم میں کسی تنگ ذہنی اور تعصب کو راہ نہیں دی ہے، علم کا حصول بہر حال ایک نعمت ہے چاہے وہ غیر مسلموں سے حاصل ہو؛ بلکہ ان لوگوں سے حاصل ہو، جن سے ہماری زندگی کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہے، بشرطیکہ ان سے ہمارے ایمان و عقیدہ اور ہماری مذہبی قدروں کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

اسلام کسی بھی ایسے علم کا مخالف نہیں جو انسانیت کے لیے نافع ہو، نہ وہ کسی زبان کا مخالف ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض رفقاء کو عربی زبان کے علاوہ بعض دوسری زبانوں کے سیکھنے کی ہدایت فرمائی اور فرمایا کہ تمام ہی زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں، علم نافع کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین عبادت قرار دیا ہے، [مجمع الزوائد: ج۱/ص۱۲۰] اور علم کے حصول کو ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ مقرر فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی موت کے بعد بھی تین چیزوں کا اجر اُسے پہنچتا رہتا ہے، من جملہ ان کے ایک ایسا علم ہے، جس سے اس کے بعد بھی لوگوں کو نفع پہنچتا رہے۔

افسوس کہ جس اُمت کو سب سے پہلے پڑھنے کی تعلیم دی گئی اور اس کے ہاتھوں میں قلم تھمایا گیا، وہی ہے کہ آج جہالت و ناخواندگی اور تعلیم سے محرومی اس کے لئے وجہِ امتیاز بنی ہوئی ہے اور دبی کچلی قومیں بھی اس میدان میں اسے پیچھے چھوڑ چکی ہیں، ایک ایسی قوم کے لیے جس نے سینکڑوں سال تک اس ملک کے طول و عرض پر حکومت کی ہے اور آج بھی اس ملک کا کوئی خطہ نہیں جہاں اس کی فرماں روائی اور عظمتِ رفتہ کے انمٹ اور قلب و نگاہ کو محوِ حیرت کر دینے والا نقوش موجود نہ ہوں، مگر عظمتِ رفتہ کے یہ نقوش آج ہمیں منھ چڑاتے ہیں اور زبان حال سے ہم پر قہقہہ زن ہیں کہ یہ کیسی قوم ہے کہ جس کے حال کو اس کے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں؟؟

اس ذلت اور پستی سے نکلنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ مسلم محلوں اور آبادیوں کے گلی کوچوں میں تعلیم کی ایسی ہی تحریک چلائی جائے جیسے الیکشن میں اُمیدوار ووٹوں کی بھیک مانگتا ہے، مسلمان پوری قوم کو اپنا خاندان و کنبہ تصور کریں، وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر بھی توجہ کریں اور اپنے پڑوسیوں کی بھی خبر گیری کریں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی طالب علم پڑھتے پڑھتے رُک گیا ہو، معاشی ناہمواری نے اس کے بڑھتے ہوئے قدم تھام لیے ہوں، یا وہ نفسیاتی کم حوصلگی کا شکار ہو گیا ہو، ایسے بچوں کا حوصلہ بڑھائیں اور اجتماعی طور پر سماج کے ایسے بچوں کی تعلیمی کفالت قبول کریں، ایسی درسگاہیں قائم کریں، جس کا نصب العین قوم کی خدمت ہو، جو تعلیم کو تجارت اور روپیوں کا ٹکسال نہ سمجھتے ہوں؛ بلکہ پوری اُمت کو ایک خاندان سمجھ کر ان کی خدمت کے لیے میدانِ عمل میں اُترے ہوں، جن کو ہوٹلوں اور معمولی کارخانوں میں کمسن مسلمان بچوں کا برتن دھونا اور جھاڑو دینا تڑپا دیتا ہو، جن کے چہرے بشرے سے ذہانت ہویدا ہے اور جن کی آنکھیں ان کی اندرونی ذکاوت و فراست کی چغلی کھاتی ہیں۔

جب تک قوم کے سربرآوردہ لوگوں میں پوری قوم کے لیے درد اور کسک پیدا نہ ہو، مسلمانوں کی پست حالی ان کی کروٹوں کو بے سکون اور ان کی آنکھوں کو بے آرام نہ کر دے، مسلم تعلیمی ادارے مکان کی تعمیر کے بجائے انسان کی تعمیر کی طرف متوجہ نہ ہوں، جو تعلیم و تعلّم کو تجارت کے بجائے عبادت کا درجہ دینے آمادہ نہ ہوں اور پوری قوم میں یہ احساس نہ جاگے کہ تعلیم ہی سے ہماری تقدیر وابستہ ہے، یہ ہماری شہ رگ ہے اور اس سے محرومی کے بعد کسی قوم کے لیے باعزت طور پر زندہ رہنا ناممکن ہے، تب تک ہمارا خوابیدہ نصیب جاگ نہیں سکتا اور ہم روٹھے ہوئے ماضی کو منا کر واپس نہیں لا سکتے!!

☆☆☆☆☆

حب نبویؐ

# اطاعت کے بغیر ایمان و محبت کا دعویٰ کھوکھلا

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

ماہِ ربیع الاول رسالت مآب کی آمد ووصال کا مہینہ ہے۔ضروری ہے کہ اس ماہ میں ہر مسلمان اپنی زندگی کا جائزہ لے اور اپنی زندگی سے ان امور کو خارج کرے جو رسول اکرمؐ کی سیرت اور اسوہ سے متصادم ہیں ۔گستاخانِ رسول کو سب سے کرارا جواب یہی ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لانے کے تقاضے ادا کریں۔ہماری یہ عملی دعوت دیگر ہم وطنوں کو دین اسلام سے تعارف کا ذریعہ بھی بنے گی اور آخرت میں ہماری نجات کا وسیلہ بھی قرار پائے گی۔

اسلام کی اصطلاح میں رسول اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے، خدائی ہدایات کی روشنی میں انسانوں کی رہ نمائی کرے۔اللہ پر ایمان لانے اور اسے خالق تسلیم کر لینے کا تقاضا ہے کہ ہم یہ بھی تسلیم کریں کہ اللہ نے صرف پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے؛ بلکہ ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ عام استعمال کی چیزوں خاص طور پر الیکٹرانک اشیاء کے ساتھ ایک گائڈ بک بھی دستیاب ہوتی ہے تو پھر بے شمار صلاحیتوں کے حامل انسان کو بغیر کسی رہنمائی کے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟ قرآن میں کہا گیا ہے: ’’ہمارا مالک وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کا سامان کیا‘‘۔[سورہ طٰہٰ]

انسانوں کو ہدایت دینے کے مختلف طریقے ہو سکتے تھے۔اللہ ہر انسان کو الگ الگ ہدایت نامہ دے کر بھیجتا۔اللہ کسی فرشتے کو اپنا پیغمبر بناتا، وہ فرشتہ ہر انسان کی رہنمائی کرتا یا اللہ کسی ایک انسان کو اس کام کے لیے منتخب کرتا۔یہ واضح ہے کہ پہلا طریقہ غیر فطری اور خلاف عقل ہے۔ہر انسان کو ہر وقت رہنمائی کرنا عقل کے خلاف ہے ۔ہم دیکھتے ہیں کہ ایک استاذ بھی اپنے طالب علموں کو ایک ساتھ درس دیتا ہے۔حکومت بھی اپنے نمائندے کے ذریعہ اپنے احکام نافذ کرتی ہے۔رہا دوسرا طریقہ تو اس میں یہ اعتراض ہوتا کہ فرشتے انسانوں سے الگ صفات کے حامل ہیں وہ کیسے انسانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں؟ صرف اور صرف تیسرا طریقہ ہی معقول تھا۔

اللہ نے اس کام کے لیے ایسے انسان منتخب کیے جو خود بھی بڑی صلاحیت رکھتے تھے اور اللہ نے انھیں اپنا خصوصی علم عطا کیا تا کہ وہ بندوں کو زندگی گزارنے کا صحیح صحیح طریقہ بتا سکیں اور اپنے عمل سے اس راستہ پر چل کر دکھا سکیں۔یہی اللہ کے فرستادہ بندے تھے، جنھیں ہم رسول یا نبی کہتے ہیں۔ان کی سیرت، ان کے عادات واطوار اتنے بلند اور پاکیزہ ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ان کی سچائی و راست روی، شرافت وسادگی، دیانت و ایمان داری، محبت و خیر خواہی، عفت و پاکدامنی، حقوق کی ادائیگی اور کردار کی بلندی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ان کے قول وعمل میں بے مثال یکسانیت ہوتی ہے۔ان کے یہ اخلاق اعلان نبوت سے پہلے بھی ہوتے ہیں ۔وہ اپنے سماج کے ان افراد میں شامل ہوتے ہیں جن کی صداقت و دیانت کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں ۔اعلان رسالت کے بعد ہر شخص انھیں دیکھ کر پکار اٹھتا ہے، یہ عام انسان نہیں ہیں، یہ تو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں۔اللہ کے یہ نبی ہر دور میں آتے رہے۔آخر میں حضرت محمدؐ تشریف لائے۔اب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ پر نازل کیا گیا ،قرآن تمام انسانوں کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہدایت نامہ ہے۔

رسول پر ایمان لانے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔رسول جس بات کا حکم دے اس کو مانا جائے، جس بات سے روکے اس سے رکا جائے۔ارشاد ربانی ہے: ’’رسول تمھیں جو کچھ دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، بے شک وہ سخت سزا دینے والا ہے‘‘۔ [الحشر: ۷] اگر ہم زبان سے یہ دعویٰ کریں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے سچے رسول ہیں مگر آپؐ کی ہدایات پر عمل نہ کریں تو پھر ہمارا دعویٰ جھوٹا ثابت ہوگا۔جب ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کی اطاعت نہ کرنا دراصل خدا کی اطاعت نہ کرنا ہے۔پیغمبر کی جانب سے ہم تک کسی بات کا پہنچنا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ بات برحق ہے۔چاہے ہماری سمجھ میں اس کی حکمت آئے یا نہ آئے۔جب ہم ایک شخص کو اچھا ڈاکٹر مان لیتے ہیں اور اس پر بھروسہ کر کے اس سے علاج کراتے ہیں تو اب ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کی ہر بات پر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ پھر ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مثلاً ہماری آنکھ میں درد ہے، ڈاکٹر ہمارے ہاتھ میں انجکشن لگانا چاہتا ہے، اگر ہم یہ کہہ کر انجکشن لگوانے سے انکار کر دیں کہ درد تو ہماری آنکھ میں ہے اور تم

انجکشن ہاتھ میں لگا رہے ہو تو یہ سنتے ہی ڈاکٹر ہمیں ڈانٹ کر بھگا دے گا۔ جب ہم نے اسے اچھا ڈاکٹر تسلیم کر لیا تو اب بلا چون و چرا اس کی بات ماننا چاہیے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا چاہیے اور ہم ایسا کرتے بھی ہیں، ایک معمولی ڈاکٹر کے کہنے سے ہم دوا کا استعمال کرتے ہیں، پرہیز کرتے ہیں، اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر دوا غلط طریقہ پر کھائی، یا نہیں کھائی یا پرہیز نہیں کیا تو نقصان ہوگا۔ نبی اور رسول جیسی عظیم ہستی کے تعلق سے تو ہمارا رویہ اس سے بھی زیادہ اطاعت گزاری کا ہونا چاہیے۔ حضرت محمدؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لینے کے بعد آپ کی ہر بات بلا چون و چرا ماننا ہمارے لیے ضروری ہو گیا۔ ورنہ ہم سیدھے راستہ سے بھٹک جائیں گے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے فرمایا: ''جس نے میری فرماں برداری کی اس نے اللہ کی فرماں برداری کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی''۔ [مسلم] اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ''اے رسول! آپ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو (اس کے نتیجہ میں) اللہ تم سے محبت کرے گا''۔ [آل عمران:۳۱]

کوئی شخص آنحضورؐ پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی کرے اور زندگی گزارنے کے لیے ان کے طریقہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہے۔ وہ آپؐ کی اطاعت کر کے بظاہر دنیا کی لذتوں اور مادّی فائدوں کو نہیں چھوڑنا چاہتا، یا پھر اس نے اپنے اوپر شیطان کو اتنا حاوی کر لیا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے شکنجہ سے نکلنا اس کے لیے دشوار ہے یا پھر وہ رسم و رواج اور آباء و اجداد کی اندھی پیروی میں گرفتار ہے اور اس کے ذہن و دماغ پر عصبیت کی گہری تہیں جمی ہوئی ہیں۔ ان سب صورتوں میں ایمان کامل کا دعویٰ کرنا ایک فضول بات ہے۔ آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی ہدایات کے تابع نہ ہو جائیں''۔ [جامع صغیر]

اب جب کہ آپؐ بنفسِ نفیس موجود نہیں ہیں مگر آپؐ کی سنت، آپؐ کا اسوہ، آپؐ کی سیرت اور آپؐ کی احادیثِ صحیحہ موجود ہیں۔ ایک مؤمن کے لیے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی اصل اساس اور بنیاد ہیں۔ اہل ایمان کو ہر معاملہ میں ان دونوں بنیادوں کو اصل حیثیت دینی چاہیے۔ اگر کوئی شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر زندگی کے معاملات اللہ اور رسول کی ہدایت کے مطابق انجام نہیں دیتا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ حقیقت میں وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دینی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے نہ کچھ کہتے تھے نہ کرتے تھے؛ بلکہ آپ جو کچھ ارشاد فرماتے یا کوئی دینی عمل کرتے وہ اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے کرتے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آپؐ کے بارے میں فرمایا گیا: ''وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ جو بھی کہتے ہیں وحی ہوتی ہے جو آپ کو کی جاتی ہے''۔ اللہ کے رسول کی اطاعت کا مطلب اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی نافرمانی کا مطلب اللہ کی نافرمانی ہے: ''جس نے رسول کی اطاعت کی تو حقیقت میں اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔ [النساء:۸۰]

نبی اکرمؐ پر ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم آپؐ سے محبت کریں، آپؐ سے محبت ایک مومن کے لیے ایمان کا حصہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم مجھ سے اپنی اولاد اور اپنے ماں باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبت نہ کرنے لگو''۔ [بخاری، مسلم]

آپؐ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آپؐ کی لائی ہوئی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچائیں، کیوں کہ آپؐ نے آخری حج کے موقع پر حاضرین کو یہ حکم دیا تھا کہ: ''جو لوگ حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک جو غیر حاضر ہیں، یہ باتیں پہنچا دیں''۔ اسی طرح ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا: ''خواہ ایک ہی آیت تمہیں معلوم ہو، اسے دوسروں کو پہنچا دو''۔ [مسلم]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا ایک کا تقاضا ہے کہ آپؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجا جائے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کو اس کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، پس اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود و سلام بھیجو''۔ [الاحزاب:۵۶]

جب بھی آپؐ کا اسم گرامی سنئے یا بولیے تو نام کے ساتھ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ضرور کہیے۔ بعض اہل تقویٰ تو آپؐ کا نام بے وضو نہیں لیتے تھے۔ ہر نماز کے بعد آپؐ پر درود بھیجئے، جمعہ کے دن خاص طور پر درود پڑھنے کا اہتمام کیجیے۔ درود پڑھنے کی احادیث میں بہت تاکید کی گئی اور بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ آپؐ نے درود پڑھنے اور بھیجنے والے کی شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔ درود و سلام کے بہت سے الفاظ خود نبی کریمؐ نے امت کو سکھائے ہیں۔ ان کو یاد کیجیے اور اٹھتے بیٹھتے آپؐ پر درود بھیجئے۔ احادیث میں اس شخص کو بخیل اور نامراد کہا گیا ہے جو آپؐ کا نام سن کر آپؐ پر درود نہ بھیجے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا تقاضا محبت ہے، محبت کا تقاضا اطاعت ہے اور محبت و اطاعت کا تقاضا ہے کہ آپؐ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچایا جائے اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو غالب کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

نقوش وتاثرات

# پروفیسر رشید کوثر فاروقی سئی کی وادی تک کا سفر

مولانا عبدالمتین منیری

گزشتہ دنوں ہمارے ایک عزیز محترم کے ذریعے انکشاف ہوا کہ پروفیسر رشید کوثر فاروقی کا ایک نثر پارہ ''ایک عشرہ سئی کی وادی میں'' سید احمد شہید اکیڈمی، رائے بریلی سے رمضان المبارک میں منظر عام پر آیا ہے، یہ خبر ہمارے لیے بڑی دلچسپی کی تھی، کیونکہ ابتک ہم مرحوم کو ایک بلند پایہ خطیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، ان کے دو مجموعہائے کلام 'زمزمہ'' اور ''جدید و جاوداں'' کے مقدموں کے علاوہ نثر میں آپ کی کوئی چیز ہماری نظر سے نہیں گذری تھی۔

برصغیر کے اردو ادب میں ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی میں تحریر و خطابت اور شاعری کے جوہر یکساں طور پر ودیعت کیے ہوں، بیسویں صدی کے آغاز میں ایسے دو چار نام سامنے آتے ہیں، ان میں مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، شورش کاشمیری کا نام سرفہرست ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی تحریر وخطابت کے ساتھ شاعری کی ہے، اس فہرست کے آخر آخر میں مولانا کوثر نیازی کا بھی نام آتا ہے۔

فاروقی صاحب کی مختصر سی کتاب دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی نظر سے کوثر صاحب کی نثر کیوں کر نہیں گذری، اگر گذری ہوتی تو شاید آج سے چالیس سال قبل کہے ہوئے اپنے مقولے ''رشید کی خطابت میں محمد علی جوہر اور کلام میں محمد اقبال کا پرتو نظر آتا ہے'' میں کچھ ردوبدل ضرور ہوتا۔

کوثر فاروقی کو دیکھنے اور جاننے والے اب شاذ ونادر ہی رہ گئے ہیں، آپ کے رفیقوں، ساتھیوں اور شاگردوں میں سے کسی نے آپ کی زندگی، خطابت، شاعری اور نثر نگاری پر کوئی تحریر لکھی ہو اس کا ہمیں علم نہیں۔ حالانکہ آپ کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ انہیں اس طرح بھلا دیا جائے۔

مرحوم ۱۹۷۵ء کے وسط میں جب انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج بھٹکل سے بحیثیت صدر شعبۂ انگریزی وابستہ ہوئے تھے، تو اس ناچیز کو انہیں قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا تھا، مرحوم مورخہ ۲ رجنوری ۱۹۷۵ء بھٹکل میں منعقدہ مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بحیثیت مہمان شاعر تشریف لائے تھے، اور اس مشاعرے میں آپ کی رفاقت میں مولانا عامر عثمانی، حفیظ میرٹھی، قوی ٹونکی، شمسی مینائی، شعری بھوپالی جیسے شعراء نے اپنا کلام پیش کیا تھا، جس میں مرحوم نے اپنی یہ غزل سنا کر حاضرین کو متوجہ کیا تھا:

یہ قدم قدم تامل، یہ تھکے تھکے ارادے
کہو میرکارواں سے کہ حدی کی لے بڑھا دے
سرِ بزم اے مغنی! مجھے تو نہ دے سکے گا
وہ سکوت کا ترنم جو ضمیر کو جگا دے
ابھی فتح آرزو ہے کہ شکست آرزو سے
تگ و تازِ آرزو کے نئے سلسلے ملا دے
مرے ہم نشیں اگر تو مرا ہم سفر نہیں ہے
میں چلا، خدا تجھے بھی دل درد آشنا دے
یہ کمال زندگی ہے کہ جب آفتاب ڈوبے
تو فلک کو نور دے کے نئی انجمن سجا دے
عجب امتحاں ہے کوثر یہ تمیز خیر و شر بھی
وہی آگ دے اُجالا، وہی بستیاں جلا دے

اس مشاعرہ میں شرکت کے لیے آپ پونے (مہاراشٹرا) سے آئے تھے جہاں آپ برسر روزگار تھے، جب مورخہ ۲۵ رجون ۱۹۷۵ء ملک میں ایمرجنسی لگنے کے بعد پونے میں آپ کے لیے زمین تنگ ہونے لگی تو پونا کالج کے پرانے ساتھی اور دوست ڈاکٹر سید انور علی پرنسپل انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج بھٹکل کی توجہات سے آپ کی بھٹکل میں تعیناتی ہوئی تھی۔ ۱۹۷۹ء تک تین ساڑھے تین سال آپ یہیں بھٹکل میں رہے پھر ہمارے دوست صدیق محمد جعفری مرحوم کی دعوت پر آپ دبئی میں ''الصدیق اسلامک اسکول'' کی نصاب کمیٹی سے منسلک ہوئے، اور نصابی کتاب ''ملکی وے'' کی ترتیب میں صفیہ اقبال ورق والا مرحومہ کے ساتھ شریک ہوگئے، اور اس کے لیے انگریزی میں بچوں کی چند نظمیں بھی لکھیں۔

بھٹکل میں آپ کا قیام امین الدین روڈ پر مسجد الہدی کے بالمقابل دارالمصباح کی پرانی عمارت میں تھا، اور اسی سڑک پر ایک دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہمارا مکان آتا تھا، اس وقت میں مکتب جامعہ فاروقی مسجد میں تدریس سے وابستہ تھا، اور عصر بعد گھر لوٹتے ہوئے راستے میں اپنی سائیکل روک کر چند لمحات آپ کے ساتھ گزار کر ہی گھر پہنچتا، اس طرح آپ کو قریب سے دیکھنے اور استفادہ کے خوب مواقع ملے، یہی دن تھے جب حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم کرنے کی نیت سے آپ نے ۱۷ راپریل ۱۹۷۵ء تکیہ کلاں شاہ علم اللہ، رائے بریلی کا سفر کیا تھا، مئی ۱۹۷۹ء میں تلاش معاش کے سلسلے جب میری دبئی حاضری ہوئی، وہاں صدیق جعفری کے ساتھ ملاقات ہوتی، اس زمانے میں ریکارڈ شدہ ایک مجلس ویڈیو پر اب بھی دستیاب ہے۔

کوثر فاروقی صاحب نے مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء بسواں (سیتاپور، یوپی) میں آنکھیں کھولی تھی، آپ کا پیدائشی نام رشید الحق تھا، اور آپ کے والد کا محمد سعید الحق فاروقی، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی علیہ الرحمہ سے جا ملتا تھا، گھر کا ماحول مذہبی تھا، والد ماجد عالم دین تھے، اور آپ کے چچا سورت گجرات میں امامت کرتے تھے، گھر میں تنگ دستی کا بسیرا تھا، اور حالات جس کسمپرسی میں گذر رہے تھے، اس کی عکاسی مرحوم نے ان الفاظ میں کی ہے:

''ان (خاندان کے لوگوں) میں جو مفلس تھے، انھیں غیرت نے نہال، اور جو متمول تھے، انھیں فقر نے مالا مال کر رکھا تھا۔ میری والدہ کے پرنانا نے عالی حوصلگی اور افرنگ دشمنی کی بنا پر دولت اودھ سے ''مولائی خان'' کا خطاب پایا تھا، اور سقوط اودھ کے بعد اپنے مختصر ساز و برک اور معمولی سی فوج کے ساتھ بطور خود گوروں سے جنگ کرتے ہوئے قتل ہوئے تھے .....معیشت اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جس سے سکون تو کیا، فریب سکوں ہی کی راہ نکل سکے''۔[زمزمہ/۱۵]

ایک تو دیہات کا ماحول، دوسرے دوسرے مادی وسائل سے محرومی، آپ نے تعلیم کے لیے لکھنؤ کا رخ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لکھنؤ اور علی گڑھ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں کیمونسٹ تحریک کا غلغلہ تھا اور حالات کا جبر بھی کچھ ایسا تھا کہ آپ کیمونسٹ تحریک سے متاثر ہوگئے اور بقول آپ کے ''انیس سال کی عمر تھی کہ الحاد کی طرف میں مائل ہوا پھر اشتراکیت سے کچھ فکری، کچھ عملی تعلق رہا''۔[ایضاً]

انہی دنوں آپ وقت کے عظیم خطیب اور رہنما مولانا آزاد سبحانی کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ مولانا آزاد سبحانی کی شخصیت اور آپ کی قوت خطابت کے سلسلے میں مولانا رئیس احمد جعفری ندوی اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ: ''مسجد کانپور کے حادثہ انہدام کے سلسلہ میں مولانا آزاد سبحانی شہرت کے اسٹیج پر نمایاں ہوئے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی برطرفی کے بعد کلکتہ کی امامت عید تک شہرت اور ناموری کے بہت سے مراحل خوبی وخوش اسلوبی کے ساتھ انہوں نے طے کر لیے، تقریر بڑی اچھی کرتے ہیں، تقریر نہیں کرتے جادو کرتے ہیں، بہت بڑے فلسفی بھی ہیں، تقریر میں فلسفیانہ تخیل و تجزی کے کمالات اور دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ مخالف بھی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں---محمد علی ہوسٹل میں تقریر کا انتظام ہوا، حاضرین مولانا کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے کہ وفعتاً کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کی مسلسل آوازیں آنا شروع ہوئیں، نظر اٹھائی تو مولانا کھٹ پٹی پہنے ہوئے خراماں خراماں مسکراتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں، گاڑھے کا ایک تہ بند زیب ہے، تہ بند کا باقی حصہ رونق دوش و سر بال کمتر سیاہ زیادہ تر سفید؛ لیکن سفیدی دودھ کی سفیدی نہ تھی، اس پر خاکساری کا رنگ غالب تھا، ہم میں سے بہتوں نے سمجھا مولانا کے لیے موزوں تر جگہ اسٹیج کے بجائے خانقاہ ہوسکتی تھی یا کسی مسجد کی کوٹھری شاید مولانا نے یہ بات بھانپ لی، مسکراتے ہوئے اٹھے اور تبسم کے ساتھ تقریر شروع فرمائی، یہ بے موقع تبسم بھی ناگوار گزر رہا تھا، جی چاہتا تھا اس تبسم کا جواب قہقہہ سے دیں۔ اب مولانا کی تقریر شروع ہو چکی تھی، ڈھلے ہوئے فقرے، موزوں اور مناسب الفاظ، چست اور معنی خیز جملے، صاف اور شیریں زبان، واضح اور دلنشین بیان خیالات زبان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، زبان خیال بلند پرواز کی بلندیوں پر روپوش دیکھا یہ تھا کہ جن کی زبان اچھی ہوتی ہے ان کے خیالات کی جھولی خالی ہوتی ہے، جن کے خیالات گرانمایہ ہوتے ہیں وہ بے زبان ہوتے ہیں؛ لیکن یہ شخص اقلیم خیال کا بھی فرمانروا تھا اور شہرستان زبان کا بھی تاجدار، کیا خدا کی قدرت ہے، صورت دیکھئے تو ہیچ میرز۔ باتیں سنئے تو معلوم ہو شاعر نے یہ شعر انہی کے لیے کہا ہے:

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کایں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کُلہ اند

[دید و شنید: رئیس جعفری ۵۸-۵۹]

مولانا آزاد سبحانی سے تعلق اور پھر قطع تعلق کے بارے میں کوثر فاروقی لکھتے ہیں: ''تقریباً سولہ سال کی عمر میں اشتراکیت سے متاثر ہوا، لیکن جلد ہی اس کا ردعمل ہوا اور اسلام کی طرف پلٹا''، حسن اتفاق سے مولانا آزاد سبحانی مل گئے اور تین سال ان کا ساتھ رہا اور خوب رہا، سفر میں بھی اور حضر میں بھی۔ مولانا کو بہت شفقت فرماتے تھے تاہم ان سے مجھے ایسی محبت نہ ہوسکی جس کا قوام دیر میں بنا کرتا ہے، مثلاً عجمی تصوف کا سیاسی استعمال تاکہ امت کی ناجائز پیر پرستی سے جائز فائدہ اٹھایا جاسکے، کبھی جامعہ ربانیت کا فرضی قیام، کبھی تعلیم محض پر اتنا زور کہ گویا واحد حل یہی ہے، اور کبھی روس سے ایک خفیہ معاہدے کی تجویز اور دلائل کے ساتھ اصرار کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ میرے تعلق خاطر پر ان کے تلون سے شاید کوئی ناگوار اثر نہ پڑتا؛ لیکن اشتراکیت سے ان کا معاشقہ مجھے بہت برا لگا، میں اسی دور میں اس تحریک کو اس کی علمی و عملی دونوں شکلوں میں دیکھ کر بے زار ہو چکا تھا، اس لیے مدتوں رنجشیں رہیں ہیں اور آخر معاملہ الفراق بینی و بینک پر ختم ہوا''۔

[ایک عشرہ سئی کی وادی میں/۲۵]

ہمارے خیال میں مولانا آزاد سبحانی سے شعوری طور پر قطع تعلق کے باوجود آپ کی شخصیت کا اثر آپ پر باقی رہا، ان دنوں آپ کوثر بسوانی کے نام سے پہچانے جاتے تھے، اور اپنے دور کے عظیم لغت داں نقاد و شاعر نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی مرحوم سے اپنے کلام میں اصلاح بھی لے رہے تھے۔

جن دنوں آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں گریجویشن کر رہے تھے، یہاں پر تحریک اسلامی سے وابستہ نوجوان ادیبوں کا ایک حلقہ ترقی پسندوں اور کمیونسٹ افکار وخیال رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے خلاف اور اسلامی ادب کا علم بلند کیے ہوئے تھا، ان میں م نسیم اعظمی، شاہ طیب عثمانی، شبنم سبحانی، اصغر علی عابدی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، ابو المجاہد زاہد جیسے افراد بھی شامل تھے، جو بعد میں آسمان ادب پر آفتاب و ماہتاب بن کر ابھرے، کوثر صاحب اس قافلہ میں شامل ہو گئے، بہت ممکن ہے کمیونزم اور الحاد کا ڈنک ان کے ذہن وفکر کی تہوں سے نکالنے میں ان حضرات کی رفاقت کا بھی اثر رہا ہو، یہ ادیب وانشور لکھنو سے ''نئی نسلیں'' کے نام سے جو اسلامی ادب کا ترجمان مجلّہ نکالتے تھے، اس کی مجلس ادارت میں کوثر فاروقی بھی شامل تھے، اور ۱۹۵۵ء میں جب آپ ایم اے اول کے طالب علم تھے تو آپ منتظم کی حیثیت سے مجلّہ کے انتظامی بورڈ میں ایک ذمہ دار کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں شبنم سبحانی وغیرہ کے ساتھ دو سال آپ نے جماعت اسلامی کے مرکز میں بھی گذارے تھے۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں جب آپ لکھنؤ ہی میں تھے تو آپ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی علیہ الرحمہ کی امارت میں تبلیغی جماعت میں جانے کا موقعہ نصیب ہوا، اور اس زمانے میں آپ کو حضرت مولاناؒ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی علیہ الرحمہ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملا، ان شخصیات نے تو آپ کو متاثر ضرور کیا؛ لیکن تبلیغی جماعت میں آپ کو کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔

ابھی تک آپ کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، اقتصادی بدحالی نے آپ کو ایم اے کی ڈگری بھی مکمل کرنے نہیں دی، اور آپ ۱۹۵۹ء میں مدرسۃ الاصلاح میں انگریزی زبان کے مدرس کی حیثیت سے وابستہ ہوئے، یہاں آپ نے ناظم مدرسہ مولانا بدر الدین اصلاحی اور دوسرے اساتذہ سے استفادہ کیا اور عربی زبان سیکھی۔ [زمزمہ/۲۲]

سنہ ۱۹۶۶ء میں آپ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ سے اور پھر ۱۹۶۹ء میں آپ نے انجمن خیر الاسلام کے ماتحت مہاراشٹرا کالج ممبئی میں، اور پھر یہاں سے آپ پونا کالج پونے منتقل ہوئے، اور انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج بھٹکل سے وابستگی تک یہاں تدریس سے وابستہ رہے، جہاں آپ نے اپنی خطابت اور شاعری کے زور پر اپنا ایک وسیع حلقہ بنالیا، یہاں آپ نے صالح نوجوانوں کو منظّم کرنے کی غرض سے "الشبان المسلمون" کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی تھی جس کے جوانوں نے آخر تک آپ کا ساتھ دیا۔

بھٹکل کے قیام میں آپ کی زندگی بڑی متحرک گذری، دینی فکر رکھنے والے طلبہ کا ایک بڑا حلقہ آپ سے جڑ گیا، یہ انجمن آرٹس اینڈ سائنس کالج کا سنہرا دور تھا، کالج پرنسپل ڈاکٹر سید انور علی مرحوم کی قیادت میں دینی فکر رکھنے والے اساتذہ و پروفیسر حضرات کی ایک قابل ٹیم یہاں کام کر رہی تھی، یہ دور بھٹکل میں ادبی نقطہ نظر سے ایک ایسا سنہرا دور تھا کہ ایسا دور نہ پہلے آیا نہ بعد میں، بھٹکل میں اردو شعر کہنے کی صلاحیت رکھنے والے اچھے خاصے نوجوانوں کی تعداد کو اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا، آپ کی بھٹکل موجودگی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی آمد ہوتی تو مولانا اہتمام سے آپ کو بلا کر کلام سنتے، ایک شاعر کا بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر کوئی کلام لکھتا ہے، مگر اس کلام کی حیثیت آفاقی ہو جاتی ہے، اسی نوعیت کی آپ کی ایک نظم جو اتفاق سے ایمرجنسی کے زمانے میں لکھی گئی تھی لیکن اس کا پس منظر کچھ اور تھا، اور جس کا مصرعہ ہے:

صنم صنم کو تقاضا ہمیں خدا کہیے
کمال جہل کو دانش کی انتہا کہیے
قلم کو حکم کہ بجلی کو چاندنی لکھیے
زبان پہ جبر کے پتھر کو آئینہ کہیے

پندرہ روزہ ''داعی'' ممبئی میں جب یہ شائع ہوئی، اور اس پر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نظر پڑی تو آپ نے کوثر صاحب کو مبارکباد دی اور لکھا کہ ایمرجنسی کی ایسی خوبصورت تصویر کشی کسی اور نے نہیں کی ہے۔

۳۱/ مارچ ۱۹۷۷ء کو انجمن اسلامیہ اینگلو اردو ہائی اسکول کے مخلص و دردمند قوم ہیڈ ماسٹر عثمان حسن جو بابو کی ڈیوٹی پر اچانک موت واقع ہوئی تو قوم ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوئی، اس موقعہ پر آپ نے ایک معرکۂ آراء نظم لکھی، جس کا عنوان تھا ''مرثیہ مگرکس کا''۔ جس کے چند بند ہیں:

بلندیوں سے گریزاں ہیں، پست قوم ہیں ہم
ہمیں ہے فخر کہ مردہ پرست قوم ہیں ہم
ہمیں نے حضرت عثمان کو شہید کیا
ہمیں نے ان سے جو قاتل نہ تھے قصاص لیا
یہ قوم وہ ہے جو زندوں کی جان لیتی ہے
یہ قوم وہ ہے جو مردوں پہ جان دیتی ہے

یہ قوم تودۂ خاک کے بت بناتی ہے
یہ قوم قبر کی مٹی بھی بیچ کھاتی ہے

مرحوم خود اہل زبان تھے، اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع تھا، اور محسوس ہوتا تھا کہ اس عمر میں بھی کچھ سیکھنے کا داعیہ موجود ہے، آپ اس زمانے میں جامعہ کے ایک استاد مولانا ارشاد علی ندوی سے عربی زبان کی صلاحیت میں اضافہ کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے، وہ ہم سے مصر و عالم عرب کے عربی مجلّات مطالعہ کے لیے لیا کرتے تھے۔

بھٹکل سے دبئی ہوتے ہوئے آپ کا اگلا پڑاؤ بیجاپور تھا، جہاں آپ نے بیجاپور کالج میں چند سال تدریسی خدمات انجام دیں؛ لیکن شاید اب مسافر اپنے سفر کی منزلیں بدلتے ہوئے تھک ہار چکا تھا، لہٰذا پونے میں آپ کے نیازمندوں نے آپ سے گذارش کی کہ ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہنے کے بجائے پونے ہی کو اپنی مستقل آماجگاہ بنائیں، اس طرح آپ نے وہاں پر اصلاح وارشاد کا سلسلہ جاری کیا، آخری دنوں میں آپ اپنے مادر وطن لوٹ گئے تھے جہاں ۲۵؍مارچ ۲۰۰۷ کو آپ کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ اور ایک ایسا شخص جو دہکتے ہوئے سورج کی مانند تھا، اور جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، خاموشی سے یہ دنیا چھوڑ کر چلا گیا، اور پتہ بھی نہ چلا کہ کتنی صلاحیتوں سے بھرپور شخصیت سے یہ دنیا اب خالی ہوگئی ہے، معلوم نہیں کہ اس وقت کسی اخبار نے آپ کے وفات کی دوسطری خبر بھی دی تھی یا نہیں۔

پروفیسر رشید کوثر فاروقی کی کتاب ”ایک عشرہ سئی کی وادی میں“ یوں تو مختصر سی ہے، کتاب کل (۱۲۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ عرض ناشر میں مولانا محمد نفیس خان ندوی نے اس کتاب کے بارے میں سچ لکھا ہے:

”اس سفرنامہ کا اصل موضوع (دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں) کے شب و روز اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مقناطیسی شخصیت ہے، انھوں نے صرف وہی نقوش پیش کیے ہیں جو انھیں دس دن کی محدود رفاقت اور ذاتی تجربات و احساسات کے طور پر حاصل ہوئے ہیں جن کا خلاصہ اسوۂ رسول اللہ کی عملی مثالیں ہیں جو حضرت مولانا کی زندگی کا حاصل اور سرمایہ حیات تھا، پوری کتاب مختلف ملاقاتوں کے ذکر، مختلف جگہوں پر قیام و برکات کے احساسات سے مملو ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ سب عشق رسول صلی اللہ کے متن کی تشریح ہیں جو کہیں جلی کہیں خفی ہے! دریائے سئی کے کنارے آباد دائرۂ شاہ علم اللہ کی عظیم تاریخ حضرت شاہ علم اللہ حسنی کا اتباع سنت کا جذبہ امیر المؤمنین سید احمد شہید کے سفر جہاد کا تذکرہ، اہل قلوب کی آہ نیم شبی وفغان سحر گاہی اس سفر کی روشن قندیلیں ہیں اور منزل مقصود مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بابرکات ہے، حضرت مولانا کے شب و روز کے معمولات کیا تھے، مہمانوں اور مسترشدین کی اصلاح و تربیت کا انداز کیا تھا، کیسے کیسے لوگوں سے حضرت کی ملاقاتیں رہیں، کیسے کیسے علاقوں میں حضرت تشریف لے گئے اور کیسی کیسی حکمت و موعظت کی باتیں حضرت نے بیان فرمائیں، سب کا تذکرہ بڑی گرم جوشی اور البیلے انداز میں کیا گیا ہے“۔

آپ نے سچ لکھا ہے کہ: ”پروفیسر صاحب کا بے ساختگی شگفتگی اور بے تکلفی سے بات کہہ دینے کا انداز بالکل منفرد ہے، ان کی تحریر میں بھرپور خلوص ہے، شوخی ہے، زندگی ہے، بسا اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فوارہ کی سی روانی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار بڑی تیزی اور روانی سے کر رہے ہیں اور اس روانی میں کہیں آپ بیتی کا تذکرہ ہے، کہیں مختلف جماعتوں اور شخصیات کا محاسبہ ہے، کہیں تصوف کی عقدہ کشائی ہے تو کہیں حالات کا محاسبہ! البتہ کتاب کے ایک ایک ورق میں حضرت مولانا کبھی بنفس نفیس اور کبھی بذریعہ تحریر مصنف کے ساتھ نظر آتے ہیں، گویا ایک خارجی سفر کے اندر کئی داخلی سفر ہیں اور داخلیت و خارجیت کا ایسا خوبصورت توازن ہے جس میں مصنف کے اسلوب اور اس کے مزاج نے انفرادیت کا رنگ بھر دیا ہے۔ اس سفرنامہ میں کیمرے سے صرف تصویر ہی نہیں لی گئی ہے بلکہ حضرت مولانا سے ملنے والوں کی دھڑکن اور ضمیر کی سرگوشی بھی ریکارڈ کی گئی ہے۔“

اور مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی نے حدیث رندانہ کے تحت خوب لکھا ہے کہ:

”لکھنے والا جس سرمستی و سرشاری کے عالم میں ہے وہاں محبت وعقیدت فدائیت اور فنائیت کے سارے مقامات اس طرح ایک دوسرے میں سما جاتے ہیں جہاں من و تو اپنے درمیان حرف عطف کی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے، جہاں عالم بے خودی میں کوچۂ دلدار میں بے تابانہ پھرنے والا اپنی اداؤں سے بس یہی کہتا نظر آتا ہے کہ محبت جب خون میں تحلیل ہوجاتی ہے، رگ رگ میں سما جاتی ہے تو وہ جز و مزاج ہی نہیں اصل مزاج کا مقام پالیتی ہے، تکیہ شاہ علم اللہ کی زمین کتنی ہی محدود ہو، اس کے قدموں تلے سیندی کے دونوں پاٹوں میں فاصلے کتنے ہی کم ہوں لیکن خاک و آب کے اس من سے جو گلستان تیار ہوا اس کو فاروقی قلم نے ایسے گلستان محبت سے تعبیر کیا جو صدر رشک گلستان کہلاتا ہے“۔

آپ نے مزید لکھا ہے کہ: ”اس کتاب میں

سطر سطر نظروں کو رک کر ٹھہرنے کا حکم دیتی ہے، جیسے یہ الفاظ کہ مولانا کی عظمت حقیقی ہے، اضافی نہیں، وہ چھوٹوں میں اس لیے آتے ہیں تاکہ انہیں بھی بڑا بنادیں، وہ قیادت کے تاجر نہیں، نہ احساس برتری نہ احساس کمتری، وہ ایسی آگ ہیں جس سے بپتسمہ لینے سے نئی زندگی ملتی اور جو حیات جاوداں کی سرخیاں بھی رقم کرتی ہے، وہ انسان ہیں، کبھی کبھی سخت اذیت پہنچتی ہوگی لیکن وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لاکر اس کا امالہ کردیتے ہیں''۔

یہ کتاب کے مصنف کی جسمانی اور روحانی سفر کی ایک داستان ہے جو وادی سئی میں آکر ختم ہوگئی، اس میں بے تاب روح کی تڑپ حرف حرف میں محسوس ہوتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی زندگی پر مسلسل کتابیں اور مقالات آرہے ہیں، کئی ایک کانفرنسیں بھی منعقد ہوگئی ہیں، لیکن مولانا کی زندگی پر ایسی خوبصورت تحریریں شاذ ونادر ہی نظر آتی ہیں۔ دیکھئے کوثر فاروقی نے کس خوبصورت انداز سے مولانا کی زندگی کے ایک رخ کو پیش کیا ہے:

''ایک دن مولانا نے فرمایا کہ کتب خانہ کی کتابیں دیکھ لیں، اب آیئے اپنی تصانیف بھی دکھادوں، دکھانے کے بعد مولانا نے ہنس کر کہا کہ جب کوئی کسی اور طرح یا کسی اور بات سے مرعوب نہیں ہوتا تو اسے یہ الماری دکھادیتا ہوں''۔ ایک اور جگہ بڑے کام کی ہے جہاں مولانا ابوالکلام آزاد سے حضرت مولانا کا جزوی موازنہ کیا گیا ہے، مثلاً مولانا آزاد میں تجلی طور کی جھلک تھی، بصارت کو معطل کرنے والی مگر بصیرت کو فعال بنادینے والی، مولانا ندوی میں ید بیضا کا پرتو ہے جس سے غشی طاری نہیں ہوتی بلکہ کرامت کے ظہور سے روشنی حاصل کرلی جاتی ہے۔ مولانا سے قربت بڑھی تو ان کے وجود کے خمیر پر نظر پڑی، معلوم ہوا کہ یہ شے کچھ اور نہیں صرف ''تڑپ'' ہے۔ اور مولانا سے محبت کے جذبہ کو کس طرح بیان کیا ہے کہ ''محبت حادثہ نہیں ہوا کرتی اور حادثہ ہو تو محبت نہیں ہوتی۔ یہ بجلی نہیں کہ گرے اور حواس کو اچک لے جائے یا نمو کی طاقت سلب کرلے، یہ چنگاری ہے جو چپکے سے اڑ کر آجاتی ہے اور معمورۂ دل کے خس و خاشاک کو سلگاتی رہتی ہے اور سلگتی رہتی ہے، آخر آخر کوئی راکھ بن کر اڑ جاتا ہے، کوئی کندن بن کر نکھر آتا ہے، اپنی اپنی توفیق ہے۔ تدریج کے مراحل سے گذرتی ہوئی محبت یا خون میں تحلیل ہو جاتی ہے، رگ رگ میں سما جاتی ہے اور جزو مزاج بلکہ مزاج بن جاتی ہے۔ اکثر تو اس محبت کا احساس بھی نہیں ہوتا، ایک میلان یا رجحان سا ہوتا ہے، ذہن اس کی تاویلیں کرتا رہتا ہے، مگر دل پر اس کی گرفت اور مضبوط اور مضبوط ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن شعور پکار اٹھتا ہے کہ توجیہ وتاویل کے پردے گرادو، احساس خودی کی سپر ڈال دو اور ہوش وخرد سے کہو: سر تسلیم جھکادیں کہ محبت نے کشور وجود پر قبضہ کرلیا ہے۔'' اور پھر ایک جگہ لکھتے ہیں ''پہلی نظر میں ٹوٹ پڑنے والی محبت محبت نہیں، دشمنی ہے، محبوب سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ یہ ایک خطرناک غلط فہمی ہے جو بہت جلد غلطی بن کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسی غلطی جس کا اعتراف نہیں کیا جاتا یا تدارک کرلیا جاتا ہے یا شرماشرمی میں نباہ کا روپ دے دیا جاتا ہے، جیسے محبت نہ ہو آفت ناگزیر ہو۔ یہ جھاگ کی طرح اٹھتی ہے اور جھاگ ہی کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ پیش قدمی میں بھی تیز، پسپائی میں بھی تیز۔ معلوم نہیں شیکسپیئر جیسا بالغ نظر نگاہ اولیں کی محبت کا قائل کیوں کر ہوا؟! شاید اس لیے کہ محبوب کو پانے میں ناکام رہا اور چونکہ ناکام رہا اس لیے احساس ناکامی ہی کو تمام عمر محبت سمجھتا رہا، اسے محبوب کو برتنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے زندگی بھر صورت ہی کے تصور میں کھویا رہا۔ سیرت کے پہلو سامنے آتے اور محبت کو زندگی بننے کا مرحلہ پیش آتا تو غالباً رائے بدل دیتا، اور خدا معلوم انگریزی میں یہ مقولہ کیوں کر رواج پا گیا کہ پہلا تاثر آخری تاثر ہے۔ انسانی شخصیت اتنی کثیر العناصر اتنی متنوع ہوتی ہے کہ معتبر سے معتبر وجدان بھی بیک وقت یا بیک نظر کسی کا احاطہ نہیں کرسکتا، ایک وقت میں ایک ہی پہلو نظر آئے گا۔ پھر کسی جزوی تاثر پر کل کا انحصار نہیں ہوسکتا، مثلاً آپ نے کسی کو حالت غضب میں دیکھا تو عین ممکن ہے کہ آپ یک رخی رائے قائم کرلیں اور اگر محرکات غضب کی شدت یا بے شدتی آپ کے سامنے نہیں آئی تو آپ کی رائے اور بھی غلط ہوگی، آپ اس سے وحشت کریں گے اور آپ کو خبر بھی نہ ہوگی کہ عام حالات میں وہ کتنا پیارا آدمی ہے اور اس کی شخصیت کتنی دل آویز ہے۔ یہی حال نظریہ کا بھی ہے، اگر آپ نے نظریہ کو صرف میدان جنگ میں دیکھا ہے تو آپ اسے خوں ریز قرار دیں گے''۔

حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ کی بارگاہ تک پہنچنے کا داعیہ کیسے پیدا ہوا تو اس سلسلے میں فاروقی صاحب کے جذبات دیکھئے:

''بڑے سے بڑا باغی کسی نہ کسی کو بے تنقید ضرور مانتا ہے حتی کہ صحابہ کرامؓ پر تنقید کو ضروری سمجھنے والے بھی اپنے رہ نما پر تنقید کرتے یا سنتے نہیں دیکھے جاتے، گو نظری طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ رہ نما معصوم نہیں ہے۔ یوں کہ خالص تنقیدی مزاج تقلیدی ہو نہیں ہوسکتا اور تقلید کے بغیر راہ طے کی نہیں جاسکتی۔ چنانچہ اگر ایسا روحانی رہنما مل جائے جو غیر معمولی انسانی کمزوریوں سے پاک ہو تو جادہ اتباع مل سکتا ہے اور جذبہ اتباع تسکین پا سکتا ہے--- اہل اللہ

کے ہاتھ پر بیعت سب سے زیادہ ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو ذہین وفطین اور تعلیم یافتہ ہیں یا اپنے کو ذہین وفطین اور تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں''۔

تصوف کے سلسلے میں مصنف کے جذبات ذرا ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں:

''تصوف کا استعمال غلط ہوا ہے تو صحیح کر کے دکھا دیا جائے، تاکہ غلط فہمیاں زائل ہو جائیں اور تصوف ہی پر کیا منحصر ہے، ہر بھلائی ہر نیکی کا غلط استعمال ہوا ہے، کیونکہ فطرت انسانی فتنے کو فتنہ اور شرارت کو شرارت جان کر قبول ہی نہیں کر سکتی۔ فتنے کو حق اور شرارت کو شرافت کا بہروپ رچا کر آنا ہی پڑتا ہے۔ جھوٹے صوفی ہی نہیں، جھوٹے دوست، جھوٹے رہ نما حتی کہ جھوٹے نبی بھی ہوتے ہیں؛ لیکن کسی ہوش مند نے دوستی، رہ نمائی اور نبوت کی ضرورت سے انکار نہیں کیا ہے۔ ہر جھوٹا، جھوٹ بولتے وقت یہی چاہتا ہے کہ اسے سچا سمجھا جائے اور اکثریت بھی جھوٹوں ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا سچائی پر حکم امتناعی نافذ کر دیا جائے؟ آیات قرآنی کو ثمن قلیل پر بیچنے والوں کی بھیڑ ہے تو پھر کیا قرآن کو بے قیمت سمجھ لیا جائے؟ ریا ہمیشہ خلوص ہی کا سوانگ بھرتی ہے تو کیا خلوص کی بساط لپیٹ دی جائے؟ برتن کا پانی گندہ ہو گیا ہے تو کیا پانی کے ساتھ برتن کو بھی پھینک دیا جائے؟ کامیاب زندگی کا راز ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' ہی میں مضمر ہے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اور فکر کو اجاگر کرنے والے لٹریچر میں کوئی کمی نہیں: لیکن ہماری ناقص رائے میں یہ کتابچہ اس میدان میں ایک اہم اضافہ ہے، اور قارئین میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

☆☆☆☆☆


## دولتِ عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ — تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ

مولانا عتیق احمد بستوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

جلد اول (صفحات ۴۸۸) قیمت -/450

جلد دوم (صفحات: ۷۰۴) قیمت -/550

جلد سوم (صفحات: ۵۶۰) قیمت -/500

کل میزان -/Rs.1500

رعایت کے بعد مع ڈاک مصارف -/1000 روپئے میں دستیاب ہے۔

نئی مطبوعات دیدہ زیب طباعت دولت عثمانیہ اور ترکی کی تاریخ کی مفصل داستان آسان اور دلنشیں پرایۂ بیان میں لکھی گئی۔

دولتِ عثمانیہ کا عروج وزوال، سلطان عبدالحمید ثانی کے دورِ خلافت اور ان کے کارناموں کی تفصیل، خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کا سانحہ، انجمن اتحاد وترقی اور مصطفیٰ کمال پاشا کے دورِ حکومت کے اہم واقعات، ترکی میں اسلامی بیداری کے حوصلہ افزا اقدامات وحالات، سلطان عبدالحمید ثانی کی دو ڈائریاں، نیز موجودہ صدر ترکی رجب طیب اردوگان کے مؤمنانہ اقدامات۔

مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام، لکھنؤ

ٹیگور مارگ، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

موبائل نمبر 8318841286 / 9889378176

بارکوڈیا اکاؤنٹ نمبر کے ذریعہ رقم جمع کرا کر تینوں جلدیں حاصل کر سکتے ہیں۔

Account N0 10863759700

ACADEMY OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATION

STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH LUCKNOW

IFSC CODE SBIN0000125

رحمتِ عالمؐ

# رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یتیموں کے ساتھ برتاؤ

خالد فیصل ندوی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ہی لوگوں کی ہدایت کے لیے رسولِ اعظم بنا کر اور سارے عالم کے لیے سراپا رحمت بنا کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا، فی الواقع ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم داعیٔ ومبلغ ہیں [سورۃ احزاب ۳۳/ ۴۶] اور بشیر ونذیر ہیں [سورہ سبا ۳۴/ ۲۸] تو دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان وشفیق اور نہایت ہی رحیم و کریم ہیں [سورہ توبہ ۹/ ۱۲۸] ۔یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت وشفقت معاشرہ کے تمام طبقات (مرد وعورت، بچہ وبچی، جوان و بوڑھے، دوست ودشمن، مخالف وموافق اور چرند و پرند) کو بالعموم اور معاشرہ کے دبے کچلے افراد (غریب ومجبور، سائل ومحتاج، قیدی وغلام اور یتیم و بیوہ) کو بالخصوص حاصل تھی۔ حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و رحمت کے مثالی واقعات سے پُر ہیں۔

معاشرہ کے دبے کچلے افراد میں سب سے زیادہ قابلِ رحم، سب سے زیادہ باعثِ فکر اور سب سے زیادہ لائقِ توجہ یتیم بچے وبچیاں ہیں اور یتیم اس نابالغ بچہ وبچی کو کہا جاتا ہے، جس کے باپ کا انتقال ہوگیا ہو [حصاص] چنانچہ قرآن مجید میں یتیم بچہ اور یتیم بچی دونوں کا الگ الگ حق مذکور ہے، اسی طرح حضرت ابوامامہؓ کی روایت میں صراحت کے ساتھ یتیم بچہ اور یتیم بچی کا ذکر موجود ہے۔ [مسند احمد ۵/ ۲۶۵]

دینِ اسلام سے پہلے دورِ جاہلیت میں جنگ وجدال، قتل وخون ریزی اور بدامنی وغارت گری کے سبب یتیموں کی کثرت تھی، یہ یتیم باپ جیسے مضبوط محافظ وپاسبان، بڑے مہربان وشفیق ذمہ دار اور نہایت ہی زیادہ رحیم وکریم کفیل سے محروم ہوجاتے تھے پھر ستم بالائے ستم یہ یتیم معاشرہ میں اپنوں اور غیروں کے ذریعہ ظلم وجور، بے اعتنائی وبے توجہی اور ناقدری وبے حیثیتی کا نشانہ بنتے تھے، پرورش وپرداخت، حضانت ووراثت، تعلیم و تربیت، غذا ولباس اور شفقت ورحمت سے محروم ہوتے تھے؛ لیکن درِّ یتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کے واجبی حقوق کا اعلانِ عام کیا چنانچہ آخری آسمانی کتاب قرآن مجید نے اپنی مختلف سورتوں [سورہ بقرہ، سورہ نساء، سورہ انعام، سورہ انفال، سورہ اسراء، سورہ کہف، سورہ حشر، سورہ دہر، سورہ فجر، سورہ بلد، سورہ ضحیٰ اور سورہ ماعون] میں یتیموں سے متعلق ربانی احکامات نہایت ہی اہتمام سے بیان کیا، جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ یتیم بچے و بچیاں انسانی معاشرہ میں سب سے زیادہ بر و احسان، پرورش وپرداخت، پیار ومحبت، تعلیم و تربیت، معاشی تحفظ ونمو، مالی مدد ونصرت، حسنِ معاملہ ونرم گفتاری، خاطر ومدارات اور دیگر تمام جسمانی واخلاقی بہبود وخیر خواہی کے مستحق ہیں۔

اسی طرح احادیث مبارکہ میں درِّ یتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے انسانوں کو یتیموں کے سلسلہ میں یہ جاوداں پیغام دیا کہ یتیم بچے وبچیاں دنیا میں خیر وبھلائی اور برکت وسعادت کے باعث ہیں اور آخرت میں داخلۂ جنت اور رفاقتِ رسول کے ذریعہ ہیں اور نارِ جہنم سے حفاظت کے موجب ہیں چنانچہ ایک حدیث شریف میں درِّ یتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی کس قدر مؤثر وبلیغ ترغیب دی ہے کہ: ”مسلم گھروں میں سب سے بہترین گھر وہ ہے، جس میں کوئی یتیم ہو اور اس گھر میں اس یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو، اور مسلم گھروں میں سب سے بدترین گھر وہ ہے، جس میں یتیم ہو لیکن اس کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہو“۔ [ابن ماجہ/ ۳۶۷۹] ایک دوسری حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کفالت وپرورش کو دخولِ جنت کا ذریعہ بتایا ہے اور جنت میں اپنی رفاقت وقرب کا باعث قرار دیا ہے کہ: ”میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت اور درمیانی انگلیوں کے اشارہ سے قرب کو بتایا“۔ [بخاری/ ۶۰۰۵] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف احادیثِ مبارکہ میں یتیموں کے ساتھ شفقت ومحبت اور رحم وکرم کے برتاؤ کو اجر وثواب کا موجب، دخولِ جنت کا باعث اور انسانی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بتایا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: ”اگر کوئی شخص کسی یتیم کے سر پر، محض رضائے الٰہی کے لیے پیار سے ہاتھ پھیرے تو یتیم کے سر کے ہر بال کے بدلہ میں اسے اجر وثواب ملے گا“۔ [مسند احمد ۵/ ۲۵۰] نیز ایک دوسری حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ”جو یتیم کو کھانے میں شریک کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے سوائے اس کے کہ اس نے ایسا گناہ کیا ہو جو معافی کے قابل نہ ہو“۔ [ترمذی/ ۱۹۱۷] ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے کہ: ”جو چاہتا ہو کہ اس کا دل نرم ہو، اس کی

ضرورتیں (غیب سے) پوری ہوں تو وہ یتیموں پر رحم کرے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرے، اسے اپنی طرح کھانا کھلائے تو اس کا دل نرم ہوگا اور اس کی ضرورتیں پوری ہوں گی"۔ [کنزل العمال]

ان عمومی ہدایات کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو بھی یتیم کا والی وذمہ دار قرار دیا ہے، حدیث شریف کے مبارک الفاظ یہ ہیں کہ: "جو بھی مومن (مرنے کے بعد) کوئی ترکہ (مال واسباب) چھوڑے تو اس کے موجود وارثین اس کے وارث ہوں گے اور اگر وہ قرض چھوڑ کر مرا ہے یا اس نے اولاد چھوڑی ہو تو وہ یتیم اولاد میرے پاس آجائیں، میں ان کا والی وذمہ دار ہوں"۔ [بخاری /۴۷۸۱] فی الواقع آپ صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں کے لیے سراپا شفقت ورحمت، ان کے ساتھ لطف وکرم، تسلی وتشفی اور ہمدردی وغمگساری کا معاملہ کرنے والے تھے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود درّ یتیم تھے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بڑا خیال فرمایا، معاشرہ میں ان کے حقوق کو واضح کیا اور ان کے ادائے حقوق کے لیے بڑی تاکید وترغیب فرمائی نیز اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا کے سامنے اپنا عملی نمونہ اور مثالی اسوہ بھی پیش فرمایا۔ حدیث، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں اس سے متعلق انمول ونایاب واقعات بہت زیادہ ہیں، بطورِ مثال کچھ واقعات ذکر کیے جاتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبویؐ میں، حضرات صحابۂ کرامؓ کے سامنے جنگِ موتہ کا عینی مشاہدہ بیان فرمایا پھر شہیدِ موتہ حضرت جعفر طیارؓ کے گھر (بوجھل قدموں سے) تشریف لے گئے اور ان کے یتیم بچوں کے ساتھ مثالی برتاؤ برت کر ہم امتِ مسلمہ کے سامنے اپنا اسوۂ حسنہ پیش فرمایا، پورا واقعہ ان یتیم بچوں کی دکھیاری ماں حضرت اسماء بنت عمیسؓ کی زبانی سنیے! جس کو مولانا محمد ادریس علیہ الرحمہ نے اپنے قلم گہر بار سے بڑا اچھا اردو کا جامہ پہنایا ہے کہ: "یہ حادثہ فاجعہ بیان فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، بچوں کو بلایا اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک) آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، حضرت جعفرؓ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیسؓ سمجھ گئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں روئے، کیا جعفر اور ان کے رفقاء کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اطلاع ملی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! آج وہ شہید ہوگئے۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ فرماتی ہیں: سنتے ہی میری چیخ نکل گئی اور عورتیں میرے پاس جمع ہوگئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا پکا کر بھیجو! آج وہ اپنے صدمہ میں مشغول ہیں اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس صدمہ کا بہت اثر تھا، اس غم میں تین دن تک مسجد میں ہی تشریف فرما رہے"۔ [سیرت المصطفیٰ ۲/۴۶۶] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عظیم وجلیل القدر صحابی حضرت ابوسلمہؓ کے یتیم صاحبزادہ حضرت عمروؓ کا کس قدر خیال فرمایا: ان کو کھانے میں شریک کیا اور ان کو کھانا کھانے کے آداب سکھائے، یتیم کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں دریتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مثالی نمونہ و طریقہ خود مبارک ومسعود یتیم حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما کی زبانی سنیے! وہ بیان کرتے ہیں کہ: "میں بچہ تھا اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش وتربیت میں تھا (ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا) اور میرا ہاتھ پلیٹ میں، کھانے کے دوران، ہر طرف گھوم رہا تھا (یہ منظر دیکھ کر) حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: (کھانے سے پہلے) بسم اللہ کہو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ"۔ [بخاری/۵۳۷۶، مسلم ۲۰۲۲/۱۰۸]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا یہ مثالی نمونہ واسوہ اپنے قرابت دار یتیم کے ساتھ ہے؛ لیکن ایک غزوہ سے واپسی پر ایک عام بیوہ کے ہاتھ اس کے یتیم بچوں کے لیے "نبوی تحفہ" بھیج کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک کا بہترین آئیڈیل پیش فرمایا، بخاری شریف میں ہے کہ ایک غزوہ سے واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی فروخت کرنے والی بیوہ سے پانی لیا، اس کو بڑی دعا دی اور حضرات صحابۂ کرامؓ سے حاصل کردہ زادِراہ کو اس کے یتیم بچوں کو بطورِ تحفہ بھجوایا [بخاری]۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور عام یتیم کے ساتھ بڑا حسنِ سلوک کر کے اور اس کی کفالت کا اہم ذمہ لے کر ہم امتِ مسلمہ کے سامنے یتیم کے ادائے حقوق کے لیے اپنا مثالی کردار پیش فرمایا ہے، یہ کردار ہمارے لیے بہترین مشعلِ راہ ہے، اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوعکرمہؓ غزوۂ احد میں شہید ہوگئے اور ان کے صاحبزادہ حضرت بشیر جہنیؓ یتیم ہوگئے، حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ شفقت ومحبت اور ہمدردی ودلجوئی کا برتاؤ کیا اور ان کی کفالت وحضانت کی ذمہ داری لی، حضرت بشیر جہنیؓ جب بڑے ہوئے تو اپنا یہ واقعہ خود بیان فرمایا کہ: "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بازار سے گزر رہے تھے، میں ایک طرف کھڑا رو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری کو روکا، نیچے اترے، میرے

قریب آئے اور پوچھنے لگے: میرے پیارے! کیوں رو رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ میرے ابا شہید ہوگئے ہیں، ان کو یاد کرکے رو رہا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر مجھے اپنے سینۂ مبارک سے چمٹالیا، میرے سر پر اپنا مبارک ہاتھ پھیرا اور فرمایا: بیٹا! اس بات پر خوش ہوجاؤ گے اگر میں تمہارا باپ ہوجاؤں اور عائشہ رضی اللہ عنہا تمہاری ماں بن جائیں''۔[مجمع الزوائد]

سچی بات یہ ہے کہ درِّ یتیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی مذکورہ بالا ان آیاتِ کریمہ، اپنی ان احادیث مبارکہ اور اپنے ان مثالی واقعات کے ذریعہ پوری دنیا کو انسانی معاشرہ کے اس بیکس و بے سہارا افراد (یتیم بچے بچیاں) کو اپنا قیمتی سہارا دینے کے لیے ربانی احکامات وہدایات سے روشناس کرایا، اور خود ان پر عمل کرکے پوری دنیا کو یہ دعوتِ عمل دی کہ معاشرہ کا ہر فرد ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے، ان سے پیار کرے، ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرے، ان کو پڑھائے لکھائے، ان کے متروکہ مال واسباب کی حفاظت کرے، ان کو تجارت میں لگائے اور سنِ شعور پہنچنے پر ان کا متروکہ مال واسباب انہیں واپس کردے اور نگرانی رکھے اور شادی کے قابل ہونے پر ان کی شادی بیاہ کی فکر کرے الغرض ان کی ہر جائز ضرورت کو پوری کرے تاکہ یہ یتیم بھی معاشرہ کے صالح اور کارآمد فرد بنیں، ہرگز گردشِ زمانہ کے نشانہ نہ بن جائیں اور خاندان ومعاشرہ کے بگاڑ اور بدنامی کا سبب نہ ہوں۔

بلاشبہ قرآن، حدیث اور سیرت کی ان واضح احکام، ہدایات اور تعلیمات نے عرب وعجم میں یتیموں کی حالت بدل دی، اس بے وقعت گروہ کو انسانی معاشرہ میں پوری عزت اور مطلوبہ حیثیت حاصل ہوگئی، ام المومنین حضرت عائشہؓ کا گھر یتیم بچیوں کا مسکن وماویٰ بن گیا، حضرت ابن عمرؓ بغیر یتیم کے کھانا تناول نہ کرتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی یتیم بچی کی کفالت وحضانت کے لیے اجلۂ صحابہ حضرت جعفرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا دعویٰ پیش فرمایا، درِ یتیم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے سحر انگیز انقلاب اور محیر العقول تبدیلی کی سید الطائفہ حضرت سید سلیمان ندویؒ نے کیا خوب منظر کشی کی ہے کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس وناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے، ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا، ایک ایک یتیم کے لطف وشفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا''۔ [سیرت النبی ۶/۱۴۳] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیم نوازی کا اعتراف غیروں نے بھی ببانگِ دہل کیا ہے چنانچہ برطانوی مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے کہ: ''پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خصوصی توجہ کے مرکز غلاموں کی طرح یتیم بھی رہے ہیں، وہ خود بھی یتیم رہ چکے تھے، اس لیے دل سے چاہتے تھے کہ جو حسنِ سلوک خدا نے ان کے ساتھ کیا ہے، وہی وہ دوسروں کے ساتھ رکھیں''۔[محمد اینڈ محمد ڈنزم/ ۲۵۱] اور امریکی ماہر اجتماعیت رابرٹس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیم پروری کو کس قدر عمدہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ: ''قرآن کے مطالعہ سے ایک خوشگوار ترین چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں کا کس قدر خیال تھا، خصوصاً ان بچوں کا جو والدین کی سرپرستی سے محروم ہوگئے ہوں، بار بار تاکید بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ملتی ہے..... محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں کے باب میں اپنی خاص توجہ مبذول رکھی، یتیموں کے حقوق کا بکثرت ذکر اور ان سے بدسلوکی کرنے والوں اور ان کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت وعیدیں، سیرت محمدی کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں، جس پر مسلمان مصنفین کو بجا طور پر ناز ہے''۔[سوشل لا آف دی قرآن/ ۴۰-۴۱] اور ان سب سے پہلے اس درِ یتیمؐ کے سگے چچا، ان کے والی وذمہ دار اور ان کے محافظ وپاسبان خواجہ ابوطالبؒ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں کیا خوب شعر کہا ہے:

و أبیض یستسقی الغمام بوجهه
ثمال الیتامیٰ عصمة للأرامل
[بخاری/ ۱۰۰۹]

(وہ خوبصورت ہیں، ان کے چہرۂ مبارک سے بارش کا فیضان طلب کیا جاتا ہے، وہ یتیموں کے مرجع وماویٰ ہیں اور بیواؤں کے محافظ وپاسبان ہیں)۔

نیز حضرت مولانا الطاف حسین حالیؔ علیہ الرحمہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن صفاتِ محمودہ کی بہترین ترجمانی کی ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

و صلّی اللّٰهُ تبارك وتعالیٰ علی نبیّنا محمد واله وأزواجه وذریّاته وبارك وسلّم تسلیماً کثیراً.

☆☆☆☆☆

بعثت نبویؐ

# حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چند اہم مقاصد

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

اس کائنات میں موجود ہر شے کو اللہ تعالیٰ نے کسی نہ کسی مقصد کے تحت وجود بخشا ہے، خواہ ہمیں وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بے مقصد کسی بھی چیز کی تخلیق نہیں ہوئی ہے، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا" .[ص:۲۷](ہم نے زمین، آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کو بے مقصد پیدا نہیں کیا)، تو انبیاء کرام علیہم السلام، جو اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں اشرف ترین مخلوق: انسانوں میں بھی اشرف، اعظم، اعلیٰ اور ارفع ہے، انھیں کیوں کر بے مقصد اس دنیا میں وہ بھیجتا؟ پھر افضل الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ظاہر ہے کہ بے مقصد اس دنیائے آب وگل میں نہیں بھیجا گیا، مقصد کے تحت بھیجا گیا ہے، لہٰذا آیئے! ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چند اہم مقاصد کو قرآنی آیات و احادیث کی روشنی میں جانتے چلیں:

## اللہ کو معبود ماننے کی دعوت

نبیوں کو اس دنیا میں بھیجنے کا سب سے پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ راہ گم کردہ لوگوں کو واپس راہِ راست پر لایا جائے، انھیں بتایا جائے کہ اللہ ہی معبود حقیقی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، جن اشیاء کو معبود بنالیا گیا ہے، وہ سب نیست و نابود ہونے والی چیزیں ہیں، نبیوں کی پہلی دعوت یہی ہوتی تھی، سورۂ نحل میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر کیے ہوئے احسانات کو شمار کرنے کے بعد فرمایا: "إِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ" [النحل:۲۲] (تمہارا معبود تو اکیلا اللہ ہے تو جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُن کے دل اِنکار کر رہے ہیں اور وہ سرکش ہو رہے ہیں)، یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلائی گئی کہ: "قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ" [الأنبیاء:۱۰۸، الکہف:۱۱۰، فصلت:۶] (کہہ دو کہ مجھ پر (اللہ کی طرف سے) یہ وحی آتی ہے کہ تم سب کا معبود اللہ واحد ہے تو تمہیں چاہیے کہ فرمانبردار ہو جاؤ)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مقصد کا اعلان کوہِ صفا پر چڑھ کر اول وہلہ میں ہی کر دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو جمع کر کے فرمایا تھا: "أيها الناس! قولوا لا إله إلا الله تفلحوا". (اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہہ لو، کامیاب ہو جاؤ گے)۔

## اللہ کی عبادت کی دعوت

اس دنیا میں جتنے بھی نبی آئے، ان تمام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ شیطان نے جن انسانوں کو اللہ کی عبادت سے کاٹ کر اپنی اور بتوں کی عبادت میں مشغول کر دیا ہے، انھیں اللہ کی عبادت کی طرف واپس لایا جائے، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: "وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ" (النحل:۳۶) "ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ (وہ اعلان کرے کہ) تم لوگ اللہ کی عبادت کرو"، یہی کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد یہی تھا کہ لوگ ایک اللہ کی عبادت کرنے والے بن جائیں اور معبودانِ باطل کی عبادت ترک کر دیں؛ چنانچہ جب عبدالقیس کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار باتوں کا انھیں حکم دیا تھا، ان میں سے پہلی بات "ایک اللہ کی عبادت" تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آمركم بأربع، وأنهاكم بأربع، اعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً .[صحیح مسلم، باب، حدیث نمبر:۲۶] (میں تمہیں چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں اور چار چیزوں سے روکتا ہوں: اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو)۔

## تلاوتِ آیات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد "قرآنی آیات کی تلاوت" ہے، بعثت کے اس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ"..... [الجمعۃ:۲] (وہی ہے، جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول کو بھیجا، جو ان پر قرآن کی آیات کی تلاوت کرتا ہے.....)، یہ مقصد بہت اہم ہے؛ بل کہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مقاصد میں سے ہے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس امت اور قوم کی طرف مبعوث کیا گیا تھا، وہ "امی" کے لقب سے معروف ہے، یعنی جسے نہ پڑھنا آتا تھا اور نہ لکھنا، ایسی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تعلیمی اعتبار سے بلند کرنے کا ارادہ فرمایا، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو سب سے پہلی وحی آیا، اس کا پہلا کلمہ ہی "اقرأ" ہے، تلاوتِ آیات کا پہلا مرحلہ "اقرأ" ہے، پھر اس کے بعد دوسرا مرحلہ "تلاوتِ آیات" ہے، یعنی "پڑھنا اور پڑھ کر دوسروں کو سنانا"، گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے یہ ہے کہ امت

کو ''تعلیم وتعلم'' اور ''درس وتدریس'' سے جوڑا جائے، جو ترقی کی پہلی منزل ہے۔

## تزکیۂ نفس

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ''تزکیۂ نفس'' ہے، تزکیہ کے معنی ''پاک وصاف کرنے'' کے آتے ہیں، یعنی انسانوں کے قلوب کے اندر کفر وشرک، فسق وفجور، اثم ومعصیت، بغض وعناد، حقد وحسد، کذب وغیبت اور بخل وطمع کی جو گندگیاں ہیں، ان کو کھرچ کر پھینک دیا جائے اور مصفی ومجلّٰی کردیا جائے؛ تاکہ فکر وسوچ کے اندر نکھار پیدا ہو، بعثت کے اس مقصد کو قرآن مجید کی کئی آیات میں واضح کیا گیا ہے؛ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے: "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُولاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ" [آل عمران: ۱۶۴] (اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ اُن میں انہیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک کرتا اور (اللہ کی) کتاب اور دانائی سکھاتا ہے، اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے)، کئی احادیث میں بھی اس تزکیۂ نفس پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ چنانچہ ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دعا مانگی ہے: اللھم آت نفسی تقواھا، وزکھا أنت خیرمن زکاھا. [صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۷۲۲] (اے اللہ! میرے نفس میں تقوی پیدا فرما اور اس کو پاک وصاف کردے، تو بہترین پاک وصاف کرنے والا ہے)، یہ تزکیۂ نفس بھی "اقرأ" اور "یتلو آیاتہ" سے جڑا ہوا ہے کہ ان کے بغیر تزکیہ بہت مشکل ہے۔

## تعلیمِ کتاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد ''تعلیمِ کتاب'' بھی ہے، یعنی جس کتاب کی آیات کی تلاوت کرکے لوگوں کو سناتے ہیں، اسی کتاب کی تعلیم بھی لوگوں کو دینا ہے، اس کے معانی اور مفاہیم کو واضح کرنا ہے، اس کی اجمال وابہام کو دور کرنا ہے، اس کے متنوں کی تفسیر کرنی ہے، مراد خداوندی کو سمجھانا اور آیاتِ قرآنی کی تشریح کرنی ہے؛ کیوں کہ یہ کتاب طاقوں میں سجانے کی چیز نہیں؛ بل کہ غور وفکر کرنے کی چیز ہے اور جب تک اس کی تعلیم نہیں دی جائے گی، غور وفکر درست طریقہ پر نہیں ہوسکتی، اس مقصد کو قرآن مجید کی کئی آیات میں بتایا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے: "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ" [الجمعۃ: ۲] (اور وہ انھیں کتاب (قرآن) کی تعلیم دیتا ہے)، ظاہر ہے کہ یہ تعلیم کتاب ''تدبر قرآن'' کے لئے ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ" [النساء: ۸۲] (کیا وہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے)، نیز تعلیم کتاب کا ایک بہتر طریقہ عملی تطبیق بھی ہے؛ چنانچہ قرآن کا حکم ہے: "أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" (نماز قائم کرو)؛ لیکن کہیں قرآن میں اس اقامتِ صلاۃ کا طریقۂ کار مذکور نہیں، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوا کہ اقامت صلاۃ کا طریقہ کیا ہے؟

## تعلیمِ حکمت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ''تعلیم حکمت'' بھی ہے، اب سوال ہے کہ حکمت کسے کہتے ہیں: علامہ آلوسیؒ نے اس کی کئی تفسیریں لکھی ہیں: ۱- حقائق الکتاب ودقائقہ: یعنی کتاب اللہ کے اسرار ورموز اور حقائق ومعارف، ۲- السنۃ المبینۃ: دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ کتاب اللہ کو اس سے مستغنی ہوکر سمجھا نہیں جاسکتا، ۳- الفقہ فی الدین: یعنی اس سے مراد تفقہ فی الدین (دین کی سمجھ) حاصل کرنا ہے، جو ایمان کے بعد سب سے بڑی دولت ہے، ۴- ماتکمل بہ النفوس: یعنی اس سے مراد وہ علوم ہیں، جن کی وجہ سے انسانوں کے نفوس مطیع وفرماں بردار بن جائیں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب اللہ کی معرفت حاصل ہوگی، ۵- وضع الشیٔ مواضعھا: یعنی حکمت یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کی درست جگہ پر رکھا جائے [روح المعانی: ج۱/ ص۳۸۷]، حکمت کی تمام تفاسیر ایک ساتھ بھی مراد لے سکتے ہیں، گویا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ''کتاب اللہ کے اسرار ورموز اور حقائق ومعارف بیان کرنا، کتاب اللہ کو سمجھنے کے لئے سنت کی طرف رجوع کرنا، تفقہ فی الدین کی تعلیم دینا، انسانوں کو ایسے علوم سے آراستہ کرنا، جو انھیں معرفتِ خداوندی سے روشناس کرادے اور ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے کی تعلیم دینا'' وغیرہ ہے۔

## تاریکی سے روشنی کی طرف نکالنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالیں، یہ تاریکی کفر وشرک کی تاریکی، گناہ ومعصیت کی تاریکی، بغض وعناد کی تاریکی، کذب وبہتان کی تاریکی وغیرہ ہیں، ان تاریکیوں سے لوگوں کو نکال کر ایمان واسلام کی روشنی، نیکی وصلاح کی روشنی، محبت والفت کی روشنی اور صدق وصفا کی روشنی کی طرف لانا ہے، قرآن مجید نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے: "رَسُولاً يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللّٰهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" [الطلاق: ۱۱] (اور اپنے) پیغمبر (بھی بھیجے ہیں) جو تمہارے سامنے اللہ کی واضح المطالب آیتیں پڑھتے ہیں تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور عملِ نیک کرتے رہے ہیں ان کو اندھیرے

سے نکال کر روشنی میں لے آئے)۔

**عدل وانصاف**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کی بعثت ایک ایسے معاشرہ میں ہوئی، جہاں طاقت ور، کمزوروں کو کھا جانے کی کوشش کرتا تھا، لہٰذا بعثت نبوی کا ایک مقصد یہ بھی قرار پایا کہ لوگوں کے مابین عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے کیے جائیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيماً" [النساء:۱۰۵] (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے تاکہ اللہ کی ہدایات کے مطابق لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کرو اور (دیکھو) دغابازوں کی حمایت میں کبھی بحث نہ کرنا)، یہ وہ مقصد ہے، جس نے دبے کچلے لوگوں کو ان کا جائز حق دلایا، ورنہ حقدار کو حق کہاں ملتا تھا؟

**تبشیر وانذار**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک مقصد ان لوگوں کو خوش خبری سنانا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور جو لوگ ان احکام سے روگردانی کرتے ہیں، ان کو دردناک عذاب سے ڈرانا ہے؛ تاکہ وہ حق کے راستے کو چن سکیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّراً وَنَذِيراً" [الفرقان:۵۶] (اور ہم نے آپ کو خوش خبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا)، دوسری جگہ ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ" [سبأ:۲۸] (اور (اے محمد!) ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

**اتمام حجت**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں پر اتمام حجت کردی جائے؛ تاکہ لوگ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ ہم تو ناواقف تھے، ہمیں کسی نے کبھی تنبیہ نہیں کی، ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ایک اللہ کی عبادت کرنی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "رُسُلاً مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزاً حَكِيماً" [النساء: ۱۶۵] (خوش خبری سنانے اور ڈرانے والے رسول (بھیجے)؛ تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر حجت ہوجائے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے)، لہٰذا رسولوں کی آمد کے ساتھ حجت تمام ہوچکی ہے، اب کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔

**محاسن اخلاق کی تکمیل**

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد "محاسن اخلاق کی تکمیل" ہے؛ کیوں کہ یہی وہ چیز ہے، جو انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے، اس کے اندر تمام طرح کے خیر وصلاح، دینداری، فضل ومروءت اور احسان وعدل داخل ہوجاتے ہیں، اسی لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعثت لأتمم حسن الأخلاق. [المؤطا للإمام مالک، حدیث نمبر: ۲۶۵۵] (حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے مجھے بھیجا گیا ہے)، دوسری حدیث میں ہے: إنما بعثت لأتمم صالح الأخلاق. [جامع الأحادیث للسیوطی، حدیث نمبر: ۸۸۹۱] (میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔

یہ ہیں وہ بنیادی مقاصد، جن کی تکمیل کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں مبعوث کیا گیا، اب نبی کی امت کو بھی چاہیے کہ وہ ان امور کی انجام دہی میں اپنے آپ کو لگائے اور اس کے لیے کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے، آمین!

☆☆☆☆☆

## سارے عالم کے لیے ایک مستقل درس

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ بنا کر نہیں بھیجے گئے، کسی دوسرے عالم کی مخلوق کی حیثیت سے نہیں اتارے گئے، حوائج بشری سے بے نیاز ہوکر نہیں مبعوث ہوئے، انسان بنا کر، بشریت کے تمام اوصاف ولوازم، تمام احتیاجوں اور ضرورتوں کے پابند بنا کر اس ظلمت کدۂ گیتی کو مطلع انوار کرنے کے لیے بھیجے گئے، شادیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں، ایک نہیں کئی کئی، اولادیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد ہوئیں، بعض زندہ رہیں اور بعض نے حضورؐ کے سامنے وفات پائیں، دوست بھی حضورؐ کے بہت سے تھے اور دشمن بھی تھے، مخلصین کا بھی ایک گروہ تھا اور منافقین کا بھی، عسرت کا بھی زمانہ گزرا اور خوش حالی کا بھی، لڑائیاں بھی بہت سی ہوئیں اور امن کا زمانہ بھی گزرا، محاربات میں کبھی فتح بھی ہوئیں اور کبھی اس کے برعکس، خلقت کے رد وانکار کا بھی تجربہ فرمایا اور مقبولیت ومرجعیت کا بھی، غرض انسانی زندگی میں گرم وسرد، نشیب وفراز کے جتنے مواقع پیش آسکتے ہیں، سب سے ہوکر وہ پاک وطاہر زندگی گذری اور اس طرح بے داغ گذری کہ آج محض اس کا مطالعہ سارے عالم کے لیے ایک مستقل درس بن سکتا ہے۔

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

# ڈاکٹر زیڈ حسن کی کاوش
# 'مرزا غالب اور جان کیٹس - فکر وفن کا تقابلی مطالعہ'
# پر ایک نظر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

انسان مغرب کا ہو یا مشرق کا، زبان اس کی عربی ہو یا فارسی، وہ سیاہ فام ہو یا سفید نسل کا، تاہم رشتوں کی یکسانیت، سرور وغم کی کیفیت، صحت و مرض کی کشمکش، معاش واقتصاد کی جدوجہد، اقدار وروایات کی پاسداری دونوں کو باہم مماثل ومشابہ بناتے ہیں۔ مشرق کی خاک سے اٹھنے والا ایک شاعر اور ادیب، زندگی کے وہی جذبات و احساسات اور افکار وخیالات اپنے دل و دماغ میں رکھتا ہے جو مغربی افق کے سایہ تلے پرورش پانے والے کسی شخص کے دل و دماغ میں بستے ہیں۔ تاہم تہذیب وتمدن اور معاشرت کا فرق، اقدار و روایات کی دو رنگی اور لسانی خصائص کی دوئی ان جذبات واحساسات اور افکار وخیالات کی ادائیگی میں بہ طریقِ لزوم اپنا کردار ادا کرتے اور دونوں کے درمیان فرق کو نمایاں کرتے ہیں...... اتنا کہ جس قدر مشرق ومغرب میں زمینی مسافت ہے اسی قدر ان کے ادبی رنگ وآہنگ میں عدمِ مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ لہذا فنی اصول وقواعد میں دو مختلف القومیت و الوطنیت شعر و ادب کا تقابل کرکے ان کے قد وکاٹھ کا اندازہ لگانا اور ان کی باہم درجہ بندی کرنا کوئی مشکل کام نہیں؛ لیکن اس کے اندر اظہار وادائیگی کی مماثلت تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں؛ بلکہ اس سے بڑھ کر بھی اگر کوئی تعبیر ہو...... اس طرح کی عرق ریز مہم اگر کسی مہم جو کے ذریعہ انجام دیے جانے کی کوشش کی جائے تو اس کے طبع زاد ہونے اور سرقہ وتوارد سے پاک ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

محترم المقام جناب زیڈ حسن قبلہ کی یہ کاوش جو ''مرزا غالب اور جان کیٹس - فکر وفن کا تقابلی مطالعہ'' کے عنوان سے معنون ہے' راقم سطور کے نزدیک اہم اور قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے آسمانِ ادب کے بعید الطرفین ستاروں کے درمیان 'وجہِ تشبیہ' تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اک ایسے دور میں جہاں ناقدانہ بصیرت دن بدن کمزور پڑتی جارہی ہے' ہم ان کو اس کاوش سے زیادہ اس ادبی بصارت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں جس کا کچھ حصہ کسبی سہی تو کچھ یقیناً وہبی بھی رہا ہوگا۔

مرزا غالب دہلوی کا تقابل متعدد ہم زبان شاعروں سے کیا گیا ہے؛ ان میں میر بھی ہیں، حالی بھی، اور بیدل بھی ہیں، اقبال بھی...... میرے علم کی حد تک...... اور بھی ہوسکتے ہیں، اور بعید بھی نہیں؛ کیونکہ شعری خصائص اور شخصی کوائف متعدد ضرور ہوتے ہیں' تاہم کسی میں کسی سے، تو کسی میں کسی سے تشابہ اور مماثلت ہو ہی جاتی ہے؛ البتہ غیر ہم زبانوں میں انگریزی کے کیٹس سے اس تقابل کے علاوہ عربی کے معروف شاعر متنبّی سے بھی ان کا موازنہ کیا جاسکتا ہے، جس نے عہد مابعد الاسلام میں عربی شاعری میں وہی مقام پیدا کیا جو ماقبل الاسلام امرءالقیس کو حاصل تھا؛ اس کو 'ملک الشعراء' کا لقب دیا گیا تو متنبّی کو 'شاعر العرب' کے خطاب سے نوازا گیا۔

غالب اور متنبّی کے درمیان قدر مشترک تلاش کی جائے تو دونوں ہی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے نئے نئے خیالات ونظریات، افکار و تصورات اپنی اپنی شاعری کے ذریعہ اپنی اپنی زبان کو عطا کی ہیں، اور دونوں ہی اعلی افکار اور بلند خیال شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

عربی، انگریزی اور اردو شاعری میں تقابلی مطالعہ میں ایک بنیادی چیز یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان میں عروض وقواعدِ شعر کی قیود و بند دیگر دونوں زبانوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اور عربی میں اردو کے مقابلہ کم ہے۔ اردو شاعری اپنے علم عروض وقواعد میں شاید دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں عروض کو برتنا انتہائی کٹھن اور دشوار عمل ہے، اور قواعد کی سختی اس پر مستزاد۔ اس لحاظ سے اردو شاعر کو تقابل کی ابتداء سے ہی فریقِ مخالف پر یک گونہ فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ میرے ناقص خیال میں اردو شاعری کے اغراض واصناف میں بھی دیگر زبانوں کے مقابلہ زیادہ تنوع ہے، اور یہ بھی اساسی طور پر اردو شاعر کے لیے ایک امتیاز ہے۔

ان سب پر مستزاد غالب اور کیٹس کے شعری ادب کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لینا اک لازمی امر ہے کہ دونوں جس دور کے ہیں' اس میں انگریزی زبان ایک ترقی یافتہ زبان تھی، اور اردو کو کہہ سکتے ہیں وہ اک ترقی پذیر زبان تھی جو نوخیزی کے دور سے گذر رہی تھی، اور جس کے نین ونقوش بھی پورے طور پر واضح نہیں ہوسکے تھے۔ بجا طور

پر کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے اپنی زبان کی ترقی و نشو ونما میں قابلِ قدر حصہ لیا، جب کہ کیٹس کے ساتھ ایسا نہیں؛ اس نے محض اپنی ترقی یافتہ زبان میں اپنے کلام کو شامل کیا، اور اس کے معیار و مقام کی بقا میں حصہ لیا۔

رہی بات اس کی کہ تقابلی مطالعہ کا مقصد یا غرض و غایت کیا ہے؟ تو راقم کی نگاہ میں تقابلی مطالعہ اپنی اساس میں نِرا تنقیدی عمل ہے، جس سے ہر دو فریق کے کلام کی کمیاں اور خوبیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ مزید یہ کہ دونوں کلاموں کی ان خوبیوں اور کمیوں کو ناپنا یا تولنا بھی تقابلی مطالعہ کا حصہ ہے، جس کے بعد ایک کو دوسرے پر فائق باور کرایا جاسکتا ہے۔ اس طرح اگر موازنہ ہم زبان شعراء کے مابین ہے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام پر فوقیت حاصل ہوتی ہے، اور اگر دو مختلف زبانوں کے شعراء کے درمیان ہے تو اس کے ذریعہ ایک زبان کی شاعری کو دوسری زبان کی شاعری پر فتح حاصل ہوسکتی ہے، اور غایۃ الغایات یہ کہ اس سے انسانی ادب کے ذریعہ فکرِ انسانی کا اور اس کے ذریعہ اخلاق و انسانیت کی ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔

اگر کسی ادب کا ایک تقابلی مطالعہ یہی غرض و غایت اور طریقِ کار رکھتا ہے تو اس عاجز کے نزدیک غالب اور کیٹس کے درمیان فکر و فن کے تقابلی مطالعہ میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ غالب کے ایک ایک جذبۂ و خیال کو کیٹس کے ہم نوع جذبۂ و خیال کے مقابلہ میں رکھ کر فن کی کسوٹی پر کسا جاتا، مثلاً: کسی خاص کیفیت سے متعلق غالب کا کوئی شعر ہوتا اور اس کے سامنے اسی کیفیت کا اظہار کرتی کیٹس کی شاعری ہوتی تو دونوں کے حسنِ ادا و تعبیر کا امتحان ہوتا اور فنی مہارت کا معیار متعین کیا جاتا؛ کیونکہ تقابلی ادب میں مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ واقعات کے ساتھ قوتِ تاثر و احساس اور زورِ بیان کو بھی واضح نہ کیا جائے؛ غالب اور کیٹس اگر کسی المیہ میں برابر کے شریک ہیں تو فنی تقابل میں بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی کہ اس المیہ اور المیہ کے بیانیہ کا ذکر کردیا جائے؛ بلکہ قوتِ تاثر و احساس اور قوت و جمالِ بیان کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

زیڈ حسن صاحب کی اس تالیف میں اگرچہ یہ اندازِ پیش کش تو نہیں ہے؛ تاہم اتنا ضرور ہے کہ غالب اور کیٹس کی شاعری کے موازنہ کے لیے جتنے لوازمات ہوسکتے ہیں، وہ انھوں نے بڑی محنت مشقت سے یک جا کردیے ہیں؛ خواہ وہ شخصی احوال و کوائف ہوں، یا جذب و فکر کے تکوینی عوامل یا پھر زبان و ادب کے مذاق و معیار کو تشکیل دینے والے اسباب، سارا مواد انھوں نے سلیقہ سے یکجا کردیا ہے، اور اگر تعبیر صحیح ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے عمارت کی بنیادیں اور ستون رکھ دیے ہیں، اور کوئی بھی فنی معمار اس پر تقابلی مطالعہ کی عمارت قائم کرسکتا ہے؛ گویا خاکہ تیار ہے؛ لیکن اس میں رنگ بھرنا ابھی باقی ہے۔

یہ بات گرچہ درست معلوم ہوتی ہے کہ اس وقیع کتاب کے مطالعہ سے قاری کو غالب و کیٹس کے کلام کا فنی معیار اور دونوں کے درمیان ادبی فرق واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا؛ تاہم یہ بھی اک حقیقت ہے کہ فاضل مصنف نے، جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا، اس کتاب میں احوال و کوائف اور جذبات کی یکسانیت کی تلاش پر زیادہ زور صرف کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں انھوں نے تحقیق و جستجو کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اور نہ ہی اس کی حق تلفی کی، خاص طور پر دونوں شاعروں کی زندگی کی جزئیات میں انھوں نے اپنی قوتِ جستجو سے وہ باریکیاں تلاش کی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے ایک ہی تشخص دو دو شخصیتوں کو عطا کیا گیا ہے؛ جن میں سے ایک دہلی میں ظہور پذیر ہوئی اور دوسری لندن میں، ایک کا چولہ اردو تھا تو دوسری کا انگریزی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اگر کیٹس نے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ ڈاکٹر تھا تو فاضل مصنف نے غالب کے حکیم ہونے کے شواہد بھی پیش کردیے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کی بعض اور مماثلتیں وہ دقیق امکانات ہیں جن کے بارہ میں بہ ظاہر تو یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اس کا کیا اثر نقدِ ادب میں مرتب ہوسکتا ہے؛ لیکن وہی بات کہ فاضل مصنف کے نزدیک ہر اس مشابہت اور مماثلت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ممکن طور پر 'تقابلی مطالعہ' میں مدد و معاون ہوسکتی ہے۔

گویا مصنف کے نزدیک 'تقابل' یہاں 'تشابہ' کے مفہوم میں ہے، اور تشابہ بھی یہاں کلام سے زیادہ کلام کے پس منظر میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'تقابلی مطالعہ' کے جو نتائج متصور ہوسکتے تھے' کتاب ہمیں ان تک رسائی دلانے میں کسی حد تک تشنہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مصنف کا مقصد 'معاشرتی اور ثقافتی تلخیوں کے دور میں ثقافتی ہم آہنگی اور انسانیت کی یکسوئی'' کے فروغ میں حصہ لینا ہے۔ یہ ایک عظیم مقصد ضرور ہے؛ لیکن ادب کو فنی حیثیت سے ترقی دینے کے لیے کافی نہیں۔

دوسرے یہ کہ حالاتِ زندگی میں یکسانیت کے بعد جب احساس و اظہار میں یکسانیت کی بات آتی ہے تو دونوں شاعر الگ الگ راستوں پر نظر آتے ہیں؛ دونوں کے کلام کے موازنہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کا احساس الگ الگ رنگ

رکھتا ہے، جس کی وجہ سے خیال کی پرواز بھی الگ رخ اختیار کرلیتی ہے، اور انجام کار کلام میں یکسانیت کہیں بھی ظاہر نہیں ہو پاتی؛ آخر مشرقی معاشرہ کا آسمان اپنے اقدار وروایات کے ستاروں میں اس رنگ کی روشنی نہیں رکھتا جیسی مغربی سماج کے آکاش میں مغربی ریت ورواج کے تارے۔ یہیں سے دونوں شاعروں کے کلام کے درمیان اتنا نوعیاتی بُعد پیدا ہوجاتا ہے کہ دونوں کے فنی قامت میں مماثلت کا طول وحجم تلاش کرنا عملی طور پر ناممکن ہوجاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مالک رام صاحب نے مصنف کے نام اپنے ایک خط میں اس تقابلی مطالعہ کی ہمت افزائی نہیں کی۔

تاہم ایک بار پھر ہم کہیں گے کہ اس کتاب کی وقعت واہمیت کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ غالب اور کیٹس کے شخصی احوال وکوائف، اور ان کے کلام کے موضوعات، ان میں پیش کردہ افکار ونظریات اور جذبات واحساسات، اور تعبیرات ومحاورات کے تشکیلی عناصر کی مماثلت کو تلاش کرنے میں مصنف نے امکانات کو بڑی دور رس نگاہوں سے تلاش کیا ہے، اور اس باب میں انھیں کوئی موہوم سی شی بھی ملی تو انھوں نے اس کو اپنی اس تالیف میں پیش کیا ہے، اور اس میں وہ معلومات یکجا کردی ہیں، جن کی بنا پر غالب اور کیٹس کے موضوع پر کیے جانے والے آئندہ ہر تحقیقی کام کے لیے ہمیشہ یہ تالیف ایک دستاویز کی طرح اہلِ نقد کے ہاتھوں میں متداول رہے گی، اور اس کا مطالعہ اس موضوع پر اک سنگِ میل کی حیثیت ثابت ہوگا، اور یہ بات اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے لیے کہی جاسکتی ہے؛ کیونکہ اصالۃً یہ کتاب انگریزی میں ہی ہے، اور یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔

☆☆☆☆☆

## یہ دن یومِ احتساب بھی ہے!

مولانا اسحٰق جلیس ندویؒ

کیا رحمت عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یومِ ولادت اس تزک واحتشام سے منانے والے کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے کہ یہ دن یوم احتساب بھی ہے، احتساب اپنا، اپنی جماعت کا، اس نقطۂ نظر سے کہ فرد نے یا جماعت نے دعوت دین کی اشاعت اور محسن انسانیتؐ کی مثالی سیرت کے تعارف کا حق کہاں تک ادا کیا؟ اس اسوہ کو انفرادی اور اجتماعی شکل میں کہاں تک برتا گیا جس کا نمونہ دیکھ کر مخالفین دوست بن جاتے تھے، دشمن جاں نثار ہوجاتے تھے، غلط فہمیوں کے شکار ندامت کے آنسو بہاتے تھے، ضرر پہنچانے والے تلافی مافات کی کوشش وسعی میں لگ جاتے تھے۔ ☆☆☆


## سید احمد شہید اکیڈمیؒ رائے بریلی کی پیش کش

### تذکرہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی

بقلم: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

شیخ الاسلامؒ کی حیات وخدمات، قوم وملک کے لیے ان کے مجاہدانہ کارنامے، امت کی دینی وسیاسی رہنمائی اور ان کے علمی ورحانی مقام ومرتبہ کا ایمان افروز تذکرہ۔

صفحات: 160 قیمت: Rs.130

### ایک عشرہ سئی کی وادی میں

بقلم: پروفیسر رشید کوثر فاروقی

معروف ادیب ونقاد پروفیسر رشید کوثر فاروقی کی زندگی کے ان دس دنوں کی داستاں جو انھوں نے دائرہ شاہ علم اللہ (تکیہ کلاں) میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صحبت میں گذارے تھے، دس دن کی محدود رفاقت، مفکر اسلام کے شب وروز کے مشاہدے اور ذاتی تجربات واحساسات کا ایک حسین ودلکش بیانیہ! عام قارئین کے لیے علمی وادبی سوغات! صفحات: 120 قیمت: Rs.100

**سید احمد شہید اکیڈمی** دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی
رابطہ: 9919331295

فقہ وفتاویٰ

# سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

**سوال**: ایک شخص نے اپنے بڑے بھائی کے حق میں اپنے مکان کی وصیت کردی، وصیت کے وقت وہ شخص لاولد تھا، اتفاق سے وصیت کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا، یہ وصیت زبانی وتحریری دونوں طرح تھی اوراس نے اپنی زندگی میں وصیت سے رجوع نہیں کیا، اب ان کا انتقال ہوگیا ہے کہ کیا یہ وصیت نافذ ہوگی؟ جبکہ بھتیجہ وصیت کے نفاذ سے انکار کررہا ہے، اور یہ کہہ رہا ہے کہ میرے والد نے لاولد ہونے کی وجہ سے وصیت کی تھی اور ان کی حیات ہی میں میری پیدائش ہوگئی، اس لیے اب اس کی ضرورت نہیں رہی، کیا بھتیجہ کی یہ بات شرعاً مانی جائے گی؟

**جواب**: مذکورہ صورت میں مرحوم کے کل متروکہ میں سے اگر مکان کی ملکیت ایک تہائی ہے تو بھائی کے حق میں وصیت درست ہے اور یہ نافذ ہوگی، علامہ ابن عابدینؒ نے صراحت کی ہے:" لو أوصیٰ لأخیه وهو وارث ثم ولد له ابن صحت الوصیة لأخ".(اگر کسی نے بھائی کے حق میں وصیت کی حالانکہ وہ بھائی کا وارث ہورہا ہو، پھر وصیت کرنے والے کے لڑکے پیدا ہوئے تو بھائی کے حق میں وصیت درست ہوئی، بھتیجہ نے وصیت کی جو وجہ بیان کی ہے اگرچہ وہ درست ہو پھر بھی وصیت معتبر ہوگی اوراس کا نفاذ ایک تہائی مال کے بقدر ہوگا)۔

[ردالمحتار مع الدرالمختار: ج۱۰/ص۳۳۷]

**سوال**: ایک صاحب لاولد ہیں، ان کے پاس کچھ جائدادیں ہیں، وارثین میں بھتیجے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ کل جائداد ایک مدرسہ میں وقف کردیں تاکہ ان کو ثواب ملتا رہے، کیا ایسا کرنا درست ہے، کیا اس کے وارثین کو محروم کرنا لازم نہیں آئے گا؟

**جواب**: اگر شخص مذکور کے بھتیجے ضرورت مند نہیں ہیں اور کل جائیداد وقف کرکے ان کو محروم کرنا مقصود نہیں ہے، تو شرعاً وقف کرسکتے ہیں، ورنہ بہتر ہے کہ ایک تہائی مدرسہ کے حق میں وقف یا وصیت کردیں اور بقیہ ورثاء کو مل جائے۔

[الدرالمختار مع ردالمحتار: ج۹/ص۶۰۹]

**سوال**: ایک شخص نے اپنی زمین ایک مسجد کے نام اس طرح وقف کردی کہ میرے مرنے کے بعد یہ زمین مسجد کی ہوگی اور حیات میں خود مالک ہوں گا، اب اس شخص کو اس زمین کی ضرورت پڑگئی ہے اور موت پر معلق جو وقف کیا ہے، اس کو ختم کرنا چاہتا ہے، کیا ایسا کیا جاسکتا ہے؟

**جواب**: جو وقف موت پر معلق ہو، اس کی حیثیت وصیت کی ہوتی ہے جس طرح وصیت کرنے والے کو اپنی حیات میں وصیت سے رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے، اسی طرح موت پر معلق وقف سے بھی رجوع کا حق ہوا کرتا ہے، اس لیے شخص مذکور اپنی حیات میں اس وقف کو ختم کرسکتا ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ نے صراحت کی ہے:" والحاصل انه اذاعلقه بموته فالصحیح انه وصیة لازمة لکن لم یخرج عن ملکه، وله أن یرجع قبل موته کسائر الوصایا". (خلاصہ یہ کہ اگر موت پر وقف کو معلق کرے تو مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ یہ وصیت کے حکم میں ہے جو لازم ہے؛ لیکن شے واقف کی ملکیت سے نہیں نکلے گی اور اسے موت سے قبل رجوع کا حق ہوگا جیسا کہ دیگر وصیتوں میں ہوا کرتا ہے)۔

[ردالمحتار مع الدرالمختار: ۶/۵۲۹]

**سوال**: اگر اولاد میں کوئی نافرمان ہو اور والدین کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہو، اس بنا پر والدین اس کو اپنی جائداد سے محروم کردینا چاہتے ہیں، اور یہ تحریر لکھ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہماری جائداد میں میری فلاں اولاد جو نافرمان ہے، میراث نہ ملے اور ہم ان کو عاق کرتے ہیں، تو شرع اسلامی میں عاق کرنا درست ہے؟ اور والدین کا یہ فیصلہ صحیح ہے؟

**جواب**: اولاد کی سعادت اس میں ہے کہ وہ والدین کی اطاعت کریں، اپنی خواہش پر والدین کی خواہش کو ترجیح دیں اور والدین کی ذمہ داری ہے کہ تمام اولاد کے ساتھ داد ودہش میں انصاف کا معاملہ کریں، اگر کوئی اولاد نافرمان ہو اور والدین اپنی جائداد سے محروم کردینے کی تحریر لکھ لیں تو یہ تحریر شرعاً معتبر نہیں ہوگی اور ناقابل عمل ہوگی، اور اولاد مال متروکہ میں حصہ پائے گی، نافرمانی کی وجہ سے ان کا حصہ نہ ختم ہوگا اور نہ کم ہی ہوگا:"الارث جبری لا یسقط بالاسقاط".

[تکملہ شامی: ۷/۵۰۵، کتاب الفتویٰ]

(وراثت ایک ایسی چیز ہے جو خود بخود بغیر کسی اختیار کے وارث کو حاصل ہوتی ہے، مورث یا کسی کے ساقط کرنے سے ساقط نہیں ہوتی ہے)۔

☆☆☆☆☆

**ندوۃ العلماء**
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

**NADWATUL-ULAMA**
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہٖ تعالیٰ

تاریخ ۱۰ ستمبر ۲۰۲۴ء

Date 10th September 2024

# اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

| (مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی | (ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی | (مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی | (مولانا) جعفر مسعود حسنی ندوی |
|---|---|---|---|
| معتمد تعلیم ندوۃ العلماء | معتمد مال ندوۃ العلماء | مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء | ناظر عام ندوۃ العلماء |

**NADWATUL ULAMA**

| | |
|---|---|
| عطیات | A/c No. 1086 3759 711 |
| تعمیرات | A/c No. 1086 3759 733 |
| زکوٰۃ | A/c No. 1086 3759 766 |

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

**NADWATUL ULAMA**

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

**Nizamat office, Nadwatul Ulama,**
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

**+91-8736833376**

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا